

سندھ کے صُوفی شاعر

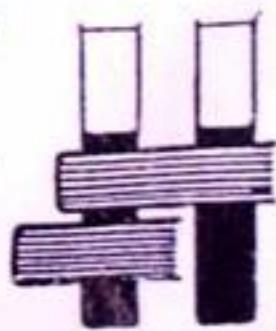
محمد ابرار احمد جوہر

سندر کے صوفی شاعر

محمد ابراہیم جویہ

فکشن ہاؤس

۱۸- فرنگ نوڈ، لاہور



جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب = سندھ کے صوفی شاعر

مصنف = محمد ابراہیم جویہ

پبلشرز = فکشن ہاؤس

18_ مرنگ روڈ، لاہور

فون: 7249218, 7237430

پرودکشن = ظہور احمد خان / رانا عبدالرحمان

معاون = ایم سرور

پرنٹر = زاہد بشیر پرنٹرز لاہور

سرور ق = ریاظ

اشاعت = ۱۹۹۷ء

قیمت = 60/- روپے

مترجم

شاہ، سچل اور سامی سندھ کے عظیم صوفی شعرا نہ صرف پاکستان میں بلکہ بین الاقوامی سطح پر پہچانے جاتے ہیں۔ ان کا پیغام ہر اہل دل انسان کی روح اور فکر کے لئے باعث تقویت و تسکین ہے جو ہر منزل پر انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔ وادی سندھ کو یہ فخر حاصل ہے کہ ان صوفی شاعروں کا تعلق سندھ کی سر زمین سے ہے۔ یہ تینوں شاعر تقریباً ہم عصر بھی ہیں۔

محمد ابراہیم جویو صاحب نے اپنی کتاب "شاہ، سچل، سامی" میں ان تینوں شاعروں کے دور کی سیاسی، مذہبی، تہذیبی اور اقتصادی صورت حل کا جائزہ پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ترجمہ کرنے کے لئے اس کتاب کا انتخاب کیا ہے۔ یہ شاہ، سچل اور سامی کے کلام کے پس منظر کی عکاسی کرتی نظر آتی ہے جو ان کے کلام میں جھلک رہا ہے۔

یہ کتاب کثیر حوالوں کی موجودگی میں جہاں اس اہم تاریخی دور پر روشنی ڈالتی ہے وہیں بعض متنات پر تخفیگی کا احساس بھی ہوتا ہے جس کا سبب یہ ہے کہ محمد ابراہیم جویو صاحب نے ایک وسیع موضوع کو اختصار کے ساتھ پیش کر کے دریا کو کوزے میں بند

کرنے کے مترادف ایک کوشش کی ہے جو اس موضوع کے ساتھ ناصلانی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس موضوع پر ایک مختینم کتاب ہونی چاہئے۔

اس کتاب کو پڑھنے سے اس عمد کا جو خاکہ ذہن میں آتا ہے وہ ان عظیم شعراء کے پیغام کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ اور چونکہ یہ کتاب سندھی زبان میں لکھی گئی تھا اسندھی زبان سے نا آشنا افراد اس سے فائدہ حاصل نہ کر سکتے ہیں۔ اس کا اردو ترجمہ کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ لوگ فائدہ حاصل کر سکیں۔

ابل زبان نہ ہونے کے باعث بعض مقامات پر مجھے کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا جس کے باعث میں نے لفت سے استفادہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ جناب محمد سلیم خواجہ صاحب، جنوں نے اپنی تمام مصروفیات کے باوجود ہر قدم پر مجھ سے تعاون کیا اور میری رہنمائی کی اپنی ذاتی کتب، بیش قیمت وقت دے کر، انہی کی مدد اور رہنمائی کے باعث یہ ترجمہ پایہ تکمیل کو پہنچا، اس تعاون کے لئے میں ان کی ازحد مشکور ہوں۔

مترجمہ

سیدہ شلگفتہ اشتیاق

۱۰۔ اکتوبر ۱۹۸۵ء

دیباچہ

میں نے اس مضمون میں شاہ، سچل اور سامی کے دور کا ایک مطلاعہ پیش کیا ہے۔ اس میں میں نے اس دور کے ساتھ اجمالی طور پر خود اس دور کے پس منظر میں سندھی سماج کے تمام تاریخی دور کی سیاسی، مذہبی، تمدنی صورت حال کا جائزہ لیا ہے۔ سندھ کی تاریخ کا یہ ایک وسیع سماجی پس منظر ہے، جس کی روشنی میں شاہ، سچل اور سامی کی شاعری کا جامع مقصد اور اس کی اہمیت کو سمجھا جا سکتا ہے۔

سندھی سماج کی تاریخ میں شاہ، سچل اور سامی ایسے ہیں جیسے زمین کے اندر اس کی تہ در تہ انمول ہیرے چھپے ہوتے ہیں۔ اس مضمون میں میں نے ان کی سدا روشن رہنے والی فکر اور پیغام کا اور سندھی سماج کے لئے اس کے معنی اور اہمیت کا جائزہ پیش کیا ہے۔

یہ کہنے کی واقعی کوئی ضرورت نہیں کہ شاہ، سچل اور سامی کے دور اور ان کی شاعری کا یہ مطلاعہ میرا اپنا مخصوصی مطلاعہ ہے، لیکن اس کی حمایت میں اتنا ضرور کہ سکے ہوں کہ اگر کوئی دوسرا بھی ان بزرگ شاعروں کے پیغام کا اسی سماجی پس منظر کی روشنی میں، جائزہ لے گا تو وہ بھی اس میں وہی معنی اور بنیادی فہم دیکھے گا جو میں نے مخصوصی

طور پر اس میں دیکھے ہیں۔

بولی اگر کسی قوم یا سماج کے تمام تجربے کی یادداشت ہے تو شاعری اس کے اہم ترین تجربے کی یادداشت ہے۔ اور اگر بات اس کی بہترن شاعری کی ہو تو اس کی افادت بھی اس کے لئے ایسی ہی انوکھی، سچی اور اعلیٰ ہو سکتی ہے۔ اس مطالعے میں شاہ، چل اور سامی کی شاعری میں اسی اہمیت اور افادت کی بات کی گئی ہے۔

میں نے سوچا کہ اس مضمون کے ساتھ اس کے مرکزی خیال کی جملیت میں سندھ کے ان لاثانی شاعروں کا انتخاب بھی دے دوں لیکن کچھ دوستوں کے مشورے پر مضمون کو جیسا تھا ویسا ہی شائع کرایا۔ اور یہ پڑھنے والوں کی سمجھ بوجھ پر چھوڑ دیا کہ اس کی روشنی میں سندھی بولی کے ان محظوظ اور محب وطن شاعروں کی تمام شاعری جو ان کے اپنے ماضی کی تذہبی تاریخ کا دریش ہے اسے خود پڑھیں، سمجھیں اور دل میں بسائیں۔

انسانی معاملات میں حسن، نیکی اور خیر، ان کی پہچان، حاصلات اور تغیر، یہ باتیں جذبے اور عشق کے سوا ممکن نہیں ہیں۔ اور جذبے اور عشق کی باتیں یکطرفہ ایمان اور بے روح تشدد اور اقتدار کے ماحول میں کبھی توہمت کا دامن تھا، کر کی ہی جاتی ہیں۔ جیسے چل سائیں نے کہنا چاہیں اور کیسیں بھی۔

جع مرد چون، کبی و کبی و کبی..... مرد ہیں جو چکتے ہیں، کسی کو اچھا لگے یا برا..... لیکن اکثر حالتوں میں، جیسے خود چل سرمست نے بھی منصب سمجھا، ان کو سیدھی طرح کرنے کے بجائے کسی رمز اور ڈھنگ سے کہنا ضروری ہوتا ہے۔

مات کیاں تین مشری تیان، کچان تین کافر، انھی واع و ذ کو سمجھی "چھرہ نو" چو
لی۔

چپ رہوں تو مشرک ہو جاؤں، کموں تو کافر، بیہڈنہ کہتا ہے اس بات کی معنی کون
ہے جو سمجھے۔

ہم جو کچھ سنتے ہیں پڑھتے ہیں اور جو کچھ سوچتے یا سمجھتے ہیں وہ اپنے ماحول کے مطابق اور اپنے مسائل کی روشنی میں۔ کسی کے سامنے کیسے مسائل ہوتے ہیں، اہم بات یہ ہے۔ اپنے ان مسئللوں کی روشنی میں ہی ہر ایک انسان اور ہر ایک سماج، اپنی راہ کا پتہ تلاش کرتا ہے، اپنی تاریخ اپنے ادب اور اپنے تمام تمدنی و ریاستی کی حاصلات میں۔ شاہ، چل اور سامی کے کلام میں سندھی سماج کے لیے اس راہ کا اس وقت کون سا پتہ، نشان موجود ہے، یہ معلوم کرنا ہم میں سے ہر ایک کا آج فرض ہے۔ میں نے اس مضمون میں ان کے کلام کے اسی نشان کو تلاش کرنے کی اپنی سی ایک کوشش کی ہے۔

مضمون کے آخر میں "ہم اور شاہ" کے عنوان سے اپنی ایک مختصر بات جو کہ حل ہی میں ہماری نئی پڑھی کی ایک نمائندہ محزن میں شائع ہوئی تھی وہ جیسی، تمیں شامل کی گئی ہے، اس لئے کہ وہ مضمون کے مرکزی خیال سے پوری طرح مطابقت رکھتی ہے بلکہ اسے ایک طرح سے اس مضمون کا اختصار بھی کہا جا سکتا ہے۔

آخر میں ایک اعتراف کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ مضمون جس طرح پڑھنے والوں کے سامنے ہے، اس طرح ہرگز ممکن نہ بتا اگر کچھ عرصہ پیشتر سندھی اربی بورڈ کی طرف سے تاریخ کے اصل مأخذات شائع نہ ہوئے ہوتے اور خاص طور پر ہمارے محترم بزرگ اور میرے عزیز دوست پیر حام الدین شاہ راشدی کی سندھ کی تاریخ پر کی گئی تحقیق زیر اشاعت نہ آئی ہوتی۔ ہم پر اس اپنے علمی ادارے اور سندھ کے اس محب وطن بزرگ عالم اور دانشور کی تھے دل سے شکر گذاری لازم ہے۔

محمد ابراہیم جویو

حیدر آباد سندھ

۱۴۷۸ء

شاھم

وارُو ویراگین کي ویلَ مَ واریج،
 قدمَ کاپرِین جا لیلاُسی لَهْج،
 پیرَت پَسیو پَتَ جِی، وجٹ کی وجیج،
 راتو دِینهن رَزْهیج، آئَ نم جیمندی آن ری.

جُز وجایو جوگھین، کُل سین آھین کِم،
 آسُن جن عدمَ، آئَ نم جیمندی آن ری.

—

جي ڀانهين وَسَ چَران، تم سنگهارن مي لَدَّ.
 تم هاچَي سندی هَدَّ، کُوكَ نم سُین کَدَھين.

جي ڀانهين وَسَ چَران، تم سنگهارن مي گهار
 جنبن سندی واَرَ، چورَ نم ايندا کَدَھين.

— —

سچل

صورت ہر جاہ دم جی، دم ریہ نہ صورت کھر جی،
در ہر جا لذت غم جی، وہ واہ گالہ خاصی.

ابلیس جی وڈائی، هر سانس تی موائی،
جیون تم در ڈلائی، نہ تم تھت نحس ناسی.

ثابت "سچل" سچاری، یارن جی یاد یاری،
وحدت جنی وساري، تن تئن متی اٹاسی.

—

چکو گوندر غیر، جی مون پچو جیل یون،
منجه کشالی کرم، آہی ویرہ وارئن.

مان وہین ماث ہر، منجه جلدیہ چل،
هتی ویہ نہ هل، قان کی ہنجین پسند کی.

— —

ساهی

آن هوندي ڀولي، وڏو جي ڀرم ٢٨
جشن ڪستوري ناپ ه، مرگهه ٻاهر ٿولي،

—

عشق ۽ عقل، پشني مادان ستم جا،
سادي لئه ”سامي“ چئي، آتم پد عمل.

—

عجائِب عقل، ساڪ ڏنو سڪ مان،
مجھي روح راضي ٿيو، ڇڏي هنگامو هُل،
وحدت ه واصل، پرجي ٿيو پریم ه.

—

ويد، هُران، قُرآن کو، سڀني ه هڪ سوت،
مجھي ڏس ”سامي“ چئي، لائي من مضبوط.

—

خالق منجهه خلق، خالق سڀ خلق ه،
مجھي کو ”سامي“ چئي، ورلاو جن ه.

—

نکو آر نه پار، سڀريان جي سڪ جو،
سُٺانتي بنان سڀ کي، اچي ڪين قرار.

مُك مان رام چئي، مانت نه اچي جيء کي،
 آن پائيء جي نانو مان بکن آج کين لهي،
 نگر پهچي کونه کو، بنان پندت کيني،
 گرگم رهت رهي، تم مُكى تشي "سامي" چشي.

—

وذو وج وچاء کهڻيء رهڻيء پهان هر،
 ولی ڪنهن گرمُك کي "سامي" پيو سماء.

—

آهن آگم آپار، راهان رام ملن جون،
 تن سڀني هر هڪري، مادا منگت نج سار.

—

کيڏي وڏائي، ڳٺيان سا پرسن جي،
 سمر درسي، سڀتل سدا، سڀ جا سُڪدائني،
 سمتا سيل اندر هر، رکن نه رائي،
 "سامي" مدائني، کن آهاكار آچاهه ٿي.

—

منجهين تَن توار وچي ويل سڀڪنهين،
 چنگ تنبورا ڪيترا، آهن ساز اپار،
 ائي پهر اندر هر "سامي" پرينء پچار،
 ڪنهن ڪنهن مگنهار، سوجوي هين مرود جي.

قومیں، ملک اور معاشرے کے ذریعے سے پہچانی جاتی ہیں۔ سندھ اور سندھی معاشرے کی شناخت بھی تین شاعروں شاہ، چل اور سامی سے ہے۔ سندھی زبان کے یہ تابندہ اور لافانی شاعر سندھی معاشرے کی کامل نیکی، بھرپور حسن اور کامل سع کے عارف، امین اور ترجمان ہیں۔

سندھی معاشرے کی حدیں محض موجودہ سندھ کی جغرافیائی اور سیاسی حدود پر ختم نہیں ہو جاتیں بلکہ یہ پاکستان اور پاکستان سے باہر تک پھیلی ہوئی ہیں۔ جہاں بھی کوئی سندھی خاندان مستقیم ہے وہاں سندھی معاشرہ موجود ہے، اور اس کی پہچان سندھی زبان اور اس کے قبل احترام شاعروں شاہ، چل اور سامی کے تعلق اور محبت میں مضر ہے۔ (سندھ میں یا سندھ سے باہر آباد کوئی بھی خاندان اگر اپنے گھر میں سندھی زبان نہیں بولتا اور سندھی سماج کی تاریخی ان لامانی ہستیوں اور سندھی تمذیب کے ان عظیم معماروں کو نہیں جانتا تو وہ خود کو سندھی سمجھنے اور کملانے کا حقدار نہیں ہے۔)

کسی بھی قوم، ملک یا معاشرے میں عظیم انسان روز روز پیدا نہیں ہوتے اور جب پیدا ہوتے ہیں تو اپنے عمد کے نئے جنم کا سبب بن کر پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا اپنے عمد کے ساتھ ایک وعدہ ہوتا ہے اور وہ تاریخ کی ایسی گھڑی کے لئے اپنی ذات میں نہیں اور

پرانی قدروں کے ترجمان بن جاتے ہیں۔ وہ نمایاں صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ بے حد اہم اور طاقتور ہونے کے ساتھ اپنے لوگوں کے لئے نئی راہیں بنانے والے ہوتے ہیں جن پر آئندہ ادوار میں بلکہ ہمیشہ کے لئے انہیں چلنا ہوتا ہے۔ اور آجے بڑھنے کے لئے دوسرے راستوں کا کوئی رخ ان کے لئے قابل شناخت یا قابل سفر ہتا ہی نہیں۔ وہ اپنے ساتھ کوئی خواب، کوئی آدرش فکر، کوئی فطری حکمت کا خزینہ لے کر آتے ہیں جنہیں وہ نہ صرف اپنے لوگوں کو آشکار کرتے بلکہ ثابت بھی کر دکھاتے ہیں کہ وہ کس طرح سے اپنے آپ کو تیار کریں، تاکہ وہ اپنی اجتماعی زندگی میں راستے کی اونچی پنج، دھوکے اور فریب کاریوں سے محفوظ رہ سکیں۔ مہذب قوموں نے ہمیشہ اپنی ایسی عظیم شخصیتوں کو پہچانا ہے۔ ان سے اپنا تعلق مضبوط کیا ہے اور انہیں اپنے لئے ایک انمول نعمت جانا ہے۔ قوموں، ملکوں اور معاشروں کی یہی محسن اور عظیم شخصیات اپنے اپنے دور کی باغی بھی ہوتی ہیں۔ وہ اپنے عمد کی مروجہ اور مسلمہ تربیتی مرثتوں کی پیداوار نہیں ہوتی بلکہ اپنی ذات میں ایک نیا اور انوکھا کردار سوئے ہوتی ہیں۔ مروجہ سرثستے اور نظامہ ای حیات تو اکثر غدر میں ڈوبے ہوئے خامیوں سے پر، تجھ نظر لوگ ہی پیدا کرتے ہیں، جن کے دلوں کے دروازے بند پڑے ہوتے ہیں۔ اور وہ دوسروں کو کمتر سمجھتے ہیں، اپنی ہربات کو دوسروں کی بات پر فوقیت دیتے ہیں۔ اور سارا وقت لڑنے جھگڑنے میں گزار دیتے ہیں۔ یوں وہ ٹھہرے پانی کی طرح ہیں جس کی بدبو میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ان کے بر عکس عظیم شخصیتیں اپنے سماج میں نئے انسان ہو کر ابھرتی ہیں، اور اس میں انسان نئے پیدا کرنے کی داعی ہوتی ہیں، ایسے انسان جو روح کی تازگی سے سرشار ہوں۔ یہ لوگ ذاتی مفاد سے بلند ہو کر بینی نوع کے مفاد کو عزز رکھتے ہیں۔ اور اپنے لیے نہیں بلکہ اپنی قوم، سماج اور معاشرے کے لئے زندہ رہتے ہیں۔ وہ اپنی پوری زندگی اور سارا وقت دوسروں کے لئے سکون کی تلاش اور نئی دنیا کی تغیری میں گزار دیتے ہیں۔ اور اپنی ذات سے یہی بے نیازی، دوسروں کے لئے فکر

مندی، صرف ایک مقصود کے حصول کے لئے ساری کوششیں، اور غیر معمولی حوصلہ، ان کی عظمت کی نشانیاں ہیں۔ ان کے لئے یہ کہنا درست ہے کہ وہ اپنے حصے کا کام خوب کر گئے ہیں اور اسی لئے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

تاریخ کی یہ لازوال ہستیاں اپنے جو ہر میں بے مثال ہوتی ہیں کیونکہ جو کچھ یہ اپنے معاشرے، ملک اور قوم کو اور اس کے ذریعے سارے عالم انسانی کو دے جاتی ہیں اس قدر کوئی دوسرا کبھی نہیں دے سکتے۔ یہ ہستیاں اپنی قوم کو جو نیا اب اور بے بہ خزانہ دے کر جاتی ہیں اس کی قدر و قیمت دنیاوی اور مادی دولت سے زیادہ رو حاصل اور تخلیقی دولت سے معین ہوتی ہے۔ دنیاوی اور مادی اشیاء خواہ کتنی ہی اعلیٰ اور ارفع کیوں نہ ہوں ان نعمتوں سے بہتر نہیں ہو سکتیں جو نعمتیں یہ ہستیاں ہمیں دے جاتی ہیں۔ کوئی ممم، دریافت یا ایجاد آج نہیں تو کل ایک آدمی کے ہاتھ سے نہیں تو دوسرے کے ذریعے ہمیشہ ممکن ہے۔ لیکن انسان کے اندر، دل و دملغ اور روح میں جو کچھ بھی ہے یا ابھر رہا ہے اور پرورش پا رہا ہے اس کا اس انداز میں انہمار کرنا کہ اسے دیکھ کر یا سن کر یہ محسوس ہو جیسے کسی نے اسی انوکھے اور نامعلوم اسرار باطن کی ایک جھلک پالی ہو، یہ ایک بنیادی اور بے بدل سعادت ہے جس کے صرف فلسفی، شاعریا فنکار ہی اہل کئے جاتے ہیں۔ اور وہی اپنے عمد اور اپنی دنیا کے حقیقی اور پچی امنگ کو اپنے اپنے انداز میں کوئی خاص ردپ دے کر آئندہ نسلوں کے لئے درٹے کی محل میں چھوڑ جاتے ہیں۔

ارسطو کا قول ہے کہ ”شاعری فلسفے سے زیادہ نگر انگلیز اور تاریخ سے زیادہ سبق آموز ہوتی ہے“ اس کی وجہ یہ ہے کہ شاعری مجموعی طور پر انسانی فطرت میں زیادہ عمیق جھانکتی ہے۔ اس کی خصوصیت بلکہ اس کی عظمت کی دلیل یہ ہے کہ وہ اندر کے تجسس کی بات کے اصل کی لفظوں کی نہیں بلکہ روح کی عکاسی کرتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ شاعری اپنے عمد پر اور اس کے لوگوں پر تجزیت روشنی ڈالتی ہے اور اس

طرح ان سے زیادہ یکدل اور قریب تر ہو کر انہیں زیادہ صاف اور درست طور پر سمجھتی اور بیان کرتی ہے۔ اس سلسلے میں عظیم شاعری کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ اپنے دور کے واقعات تفصیل سے بیان کرے یا ان کی طرف واضح اشارے کرے۔ کبھی کبھی تو ایسا نہ کرنا مروجہ حالات کے تحت اس کے لئے لازمی ہو جاتا ہے، بلکہ یہ اکثر اس کی فکارانہ صلاحیتوں کی دلیل سمجھی جاتی ہے۔ وقت کی حقیقوں کا مکمل اور سچا عکس بہرحال اس میں ضرور موجود ہوتا ہے، اور اسی خیال سے اس میں تاریخ کی جھلک ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس میں ان حقیقوں کی تعبیر بھی موجود ہوتی ہے۔ اور اس لحاظ سے اس میں فلسفہ اور حکمت کی جھلک بھی ہوتی ہے۔ ان سب کے علاوہ اس کی اطمینانی صورت حال میں تمام فنون لطیفہ کا واضح اطمینان اور اشارتی حسن بھی موجود ہوتا ہے، جسے محسوس کرنے کے علاوہ دیکھا اور سنبھال سکتا ہے۔ اور مختلف حالات میں چکھا، سونگھا اور چھوا بھی جا سکتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا درست ہو گا کہ شاعری کا یہ قابل داد حسن ہی اس کی روح ہے۔ اسی لئے عظیم شاعری ایک لافانی چیز بن جاتی ہے۔ بلکہ عظیم شاعری اور اس کے علاوہ ہر تحریر میں موجود سچائی اور حکمت کے کئی نکات اور نشان وقت کی تبدیلی کے ساتھ ہلکے اور غیر ضروری بھی بن سکتے ہیں۔ لیکن اس کا حسن اور خوبصورتی دائیگی ہے جو ہر دور اور ہر زمانے میں دل پر اثر کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری اپنی حقیقت نگاری، حکمت اور حسن کے باعث نہ صرف گذشتہ ادوار کے مقاصد اور امنگوں کی آئینہ دار اور ترجمان ہوتی ہے بلکہ ان کی توسعی اور تبلیغ کے لئے بھی سب سے زیادہ بااثر اور دائیگی وسیلہ شمار ہوتی ہے۔

سندھی سماج کی تاریخ میں مذہب اس پر ہمیشہ غالب رہا ہے۔ سندھی معاشرے کا ہر مذہب سے اس کی فاتحانہ حیثیت سے واسطہ پڑا ہے۔ آریاؤں، ایرانیوں، یونانیوں، عربوں، یہاں تک درمیان میں بدھ مت "امنک" موریہ اور کشان خاندانوں، دیدانی گپتا اور برہمن خاندانوں، ان سب نے سندھی سماج کو اپنے مذہب سے فاتحانہ یا

م از کم حکومتی انداز میں روشناس کرایا ہے۔ سندھ کی تاریخ میں صرف ایک سو سال کا عرصہ (۱۹۳۸ سے ۱۸۳۳) ہے جن مسحی فاتح قوم نے اپنی سیاسی اور تہذیبی فوتیت قائم رکھنے کے لئے مذہب کو ہتھیار کے طور پر استعمال نہیں کیا۔ بلکہ جس صورتحال کو جدید دنیا میں ”مذہبی آزادی“ کہا جاتا ہے اسے اپنی حکومتی پالیسی میں قائم رکھا۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ مذہبی آزادی کے اس مختصر دور میں ہی اقتدار اور شان و شوکت سے محروم لیکن اسے دوبارہ حاصل کرنے کا شوق رکھنے والا مذہب سیاست کو آلہ کار بنا کر، سندھی سماج کی اکائی بلکہ اس کے وجود کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچا سکا۔ سندھی سماج میں مذہب کے اس صدیوں سے قائم شدہ غلبے اور اس غلبے کی لازمی شدت اور انتہا پسندی نے سندھ کی ذہنی دنیا میں، علمی سطح پر اور بحیثیت مجموعی، دوسری باتوں کے علاوہ ایک خاص قسم کے دو ہرے رو عمل کو جنم دیا جسے ”مذہبیت“ سے مایوسی اور بیزاری لیکن ”مذہب“ سے عقیدت اور وابستگی کی روشن کہا جاسکتا ہے۔ یہاں تک کہ سندھی سماج کی یہی دو ہری کیفیت جس نے اس میں مذاہب اور مذہبی فرقوں کے سلسلے میں ہم آہنگی اور کشادہ دلی کی عام روشن کو جنم دیا تھا، سندھی تہذیب کے ارتقاء کا ایک بنیادی پتھر بن گئی۔

مذہب، ریاست اور تہذیب انسانی معاشرے کی تنقیم کے تین لازمی اور بنیادی شعبے ہیں، لازمی اور بنیادی اس لئے کہ وہ انسانی نفیات کا ازلی اور فطری تقاضوں کا جواب ہیں۔ انسان کو قطعی حیوانیت کی سطح سے انسانیت کی بلند سطح تک اپنے وجود کی سلامتی کی فکر رہتی ہے۔ وہ ان دیکھے کے خوف کا، دوسرے (اپنے جیسے حیوان) انسان سے خوف کا اور خود اپنے اندر کے حیوان (بھوک، جنس اور درد وغیرہ) کے خوف کا شکار رہتا ہے۔ ان تینوں طرح کے خطرات سے بچنے کے لئے وہ ایک بہت بڑی پناہ گاہ کی تلاش کرتا ہے جسے وہ معاشرے کا نام رہتا ہے۔ اپنی اس وسیع پناہ گاہ میں وہ ان تین خاص خطرات سے بچنے کے لئے تین خول یا غلاف تیار کرتا ہے۔ ان دیکھے خوف سے

بچنے کے لئے مذہب کا خول، دوسرے انسانوں سے بچنے کے لئے ریاست (راج، حکومت، سرکار) کا خول اور اپنے نفس یا حیوانی فطرت سے بچنے یا اس کی تشفی کے لئے تہذیب (ثافت وغیرہ) کا خول۔ مذہب کے خول میں بینہ کرائے ان دیکھی، اپنے سے قدرے دور اور اعلیٰ (واحد، دوہری، ثیشی یا کیشر نوع کی) طاقت کو مانتا یا منوانا اور اس کی دوستانہ باتوں کو اپنے بس میں کرنا یا ان سے بچتا پڑتا ہے، یہی سب کچھ ایمان یا ایقان کا مسئلہ اور سلسلہ ہے۔ ریاست کے خول میں بینہ کرائے ایک کی طاقت اور مفاد کو دوسروں کی طاقت اور مناد سے ملا کر اپنے بچاؤ اور مفاد کے انتظام کو بڑھانا پڑتا ہے، یہ سب کچھ ان کے اجتماعی طاقت اور اقتدار کی تنظیم اور اس کے استعمال کا مسئلہ ہے۔ تہذیب کے خول میں بینہ کرائے اپنی حیوانی کشش اور ذہنی یہجان کی تقدید میں اپنی سکھ اور سمجھ کے مطابق خارجی فطری وسائل کو اپنے بس میں کرنا پڑتا ہے، اور اپنی اس حیوانی کشش اور یہجان کو بھی قابو میں رکھنے کی کوشش کرنا پڑتی ہے، اور وہ سب کچھ اس کی اپنی عقل (ذہنی یا روحانی صلاحیت) کی نشوونما اور اس کے استعمال کا مسئلہ ہے۔ اس طرح ایمان یا عقیدہ مذہب کی بنیادیں بڑھانے اور مضبوط کرنے کا اور عقل یا ذہن تہذیب کی بنیاد اور اس کے پھیلاؤ اور مضبوط بنانے کے مرکزی نکتے ہیں۔

ایمان اور طاقت خودی اور گھمنڈ سے بھرے ہوئے، خود کفیل ہونے کے فریب میں جلتا رہتے ہیں، اور دائنیت کو اپنا حق سمجھتے ہوئے تھوڑے سے گھماو پھراو یا تبدیلی کے لئے بھی تیار نہیں ہوتے، اور اسی لئے وہ خاص طور پر عقل کے دشمن اور رقب ہوتے ہیں۔ کیونکہ عقل ہمیشہ دونوں کی خود پسندی، خود سری اور خود کنالت کی خام خیالی پر نہ صرف تنقید کرتی ہے بلکہ اس کی مخالفت پر آمادہ بھی رہتی ہے۔ مذہب اور ریاست کے شعبوں سے متعلق لوگ اس طرح ہمیشہ اپنی دنیا کو تبدیل کرنے سے بچتے ہیں، اور اسے جوں کا توں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، اور لوگوں کے عقل کے استعمال اور ان کی فکری آزادی کو دبائے اور روکے رکھتے ہیں۔ ایمان یعنی مذہب اپنی مضبوطی

کے لئے طاقت یعنی ریاست پر قبضہ یا کم از کم اس کی سرپرستی چاہتا ہے۔ اور اسی طرح ریاست اپنی مفہومی کے لئے مذہب پر قبضہ یا کم سے کم اس کی مدد چاہتی ہے۔ اور دونوں مل کر عقل پر بند پاندھ کر اور اسے زنجیروں میں جکڑ کے بیٹھے رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں بہترین صورت تو ظاہر ہے یہ ہونی چاہیے کہ ریاست اور مذہب، طاقت اور ایمان، دونوں عقل یعنی تہذیب کے ضابطے اور تاریخ کے زیر اثر رہیں، اور اس کی تغیریات کے کام آئیں۔ لیکن عملی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ کبھی ریاست مذہب کو تحریک بنتی ہے، اور کبھی مذہب ریاست کو، اور دونوں تہذیب کو محدود کر کے اسے آگے بڑھنے سے روکے رکھتے ہیں اس لئے کہ کہیں آزاد عقل ان کی تبدیلی یا تردید کا باعث نہ بن جائے۔ پھر جب مذہب یا ریاست، یعنی ایمان اور طاقت کچھ زیادہ عرصہ عقل (تہذیب) کی قربت سے محروم رہتے ہیں، بلکہ اسے نپھوڑ کر، بزدل اور کنگال بنادیتے ہیں، تب ان کے اپنی بے طاقت اور بے روح وجود کا حال یوں ہوتا ہے جیسے پرانے درخت اندر سے کھوکھلے ہو جاتے ہیں۔ اور صرف تنے کی ظاہری بناوٹ کے سارے جوں کے توں ایستادہ رہتے ہیں، اور ظاہری دکھاوے کے لئے ان پر ہرے پتے اور ڈالیاں جھولتی نظر آتی ہیں، بالکل اسی طرح جیسے وہ تازہ اور توانا ہوں۔ اس طرح وہ سالمہ سل بلکہ بعض صورتوں میں صدیوں تک جھوٹی پاسیداری کی جھلک دکھاتے رہتے ہیں۔ لیکن وہ بے طاقت، بے مقصد مغض رسم رواج، کریا کرم اور اداروں کے لئے چوڑے انتظام میں پھنسنے رہتے ہیں۔ اور اس طرح وہ پورے معاشرے کے لئے ایک مصیبت، اپنے خول میں بند خلق خدا، قوم اور سارے اجتماع کے لئے سوائے خواری اور آزار کے اور کچھ نہیں ہوتے۔

مذہب اور ریاست کے یوں کیجا ہونے پر سبقت یا فوتوت دونوں میں سے کسی کو بھی حاصل ہو، ذہنی جمٹ اور اقتدار پرستی جنم لیتی ہے۔ اس میں طاقت مل جل کر حکمران اور ملائکی صورت میں ایک آستانے پر جمع ہو جاتی ہے، اس نظریے کی بنیاد پر کہ

تمام طاقت کا سرچشہ کوئی ان دیکھا اصول ہے، جس تک رسائی محدود اور مخصوص ہے۔ اس صورت حل کے باعث تمام خواہشات و جذبات مردہ ہو جاتے ہیں۔ زندگی کے پاس دینے کے لئے، بعد ازاں صرف دونتھے رہ جاتے ہیں۔ حاکم اور درویش، امیر اور فقیر۔ جس مجھے بھی ان دونوں کی بادشاہت ہے ذہن سے کائناتی یا نظری مطالعے کے لگن ختم ہو جاتی ہے اور تمام امنگیں دم توڑ دیتی ہیں، کیونکہ کائنات مکنہ آسان اور مستند معنی "دنیا اور آخرت" اور علم کے معنی "الہامی کتاب" اور آدرش کے معنی "روح کی نجات" کے رہ جاتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اس صورتحال میں اپنے وجود سے بلند اور اپنے وجود سے باہر انسان نہ تو چڑھ سکتا ہے نہ نکل سکتا ہے۔ مذہب اور ریاست کے اس ذہنی تعطیل کے باعث آخر کار ریاست کی آپیشاہی بڑھتی اور مضبوط ہوتی ہے، یعنی طاقت اور محض طاقت، اور وہ پھر مذہب کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتی ہے چاہے مذہب اپنی برتری کی تقدیق میں کتنی ہی مبالغہ آرائی سے کام کیوں نہ لے۔ "نیعتا" اس اتحاد میں مذہب اور ریاست ایک دوسرے کے زوال کا سبب بن جاتے ہیں اور معاشرے میں اپنے منصبی اور بنیادی افعال پورے کرنے کی البتہ کھو دیتے ہیں۔ نہ فرد کو ریاست میں جان و مال اور عزت کی ضمانت ملتی ہے، اور نہ مذہب انسان کے لئے ان دیکھنے سے امید اور خوف کے موڑ دیلے یا تسلی و تقویت کا کوئی کام دے سکتا ہے۔

جب کسی معاشرے میں مذہب اور ریاست اپنے جمود، تشدد اور تنگ نظری کے اس نکتے پر پہنچ جاتے ہیں، تو معاشرہ بحرانی کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے۔ ایمان اور طاقت جامد ہو جاتے ہیں، اور جامد ہی رہنا چاہتے ہیں۔ لیکن عقل و جذبات اور دلوں متحرک ہیں اور آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ ان کے آگے بند نہیں باندھا جا سکتا۔ اس گھنٹن کے باعث حساس ذہنوں میں کسی جنت کا خواب جلوہ گر ہوتا ہے جبکہ عام آدمی بیزاری اور انعام کے جوش میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں آگ کے بھرک اٹھنے اور

دھمکے کو روکنا مشکل ہوتا ہے۔ انسانی فطرت کی نیکی کا اصول کسی بہشت کے خواب پانے اور اپنانے کا یہی احساس ہے، اس کی اچھائی کی علامت کسی موجود جنم کے خلاف اس کا یہی انتقامی جوش ہے، صاف اور سچا جوش، پرانے کو مٹانے کا اس قدر نہیں بلکہ نئے کو آگے لانے کا یہی جوش عظیم نتیجوں کو جنم دتا ہے۔ جدید اور اعلیٰ حسن کا یہ لطیف، دلکش اور تیز تر احساس اور اس لامانی حسن کی مقتضی کا یہ سچا اور خود فروشنہ جذبہ قوموں، ملکوں اور معاشروں کے بھرائی دور میں ہی پیدا ہوتا ہے، اس لئے کہ بھرائی عی حالات کی کیا پلت میں قدرتی ذریعہ بنتے ہیں، اور بھرائیوں میں ہی قوموں کی قست کے بنیادی سوالات بھرتے ہیں، اور ان کے حل کے لئے زمین ہموار ہوتی ہے۔ بھرائیوں میں کتنے ہی بے جان اور غیر ضروری ادارے ختم ہو جاتے ہیں، جو تاریخ یا روایات کے سبب معاشرے کے وجود سے پچکے ہوئے ہوتے ہیں، جبکہ عام حالات میں وہ آسانی سے ختم نہیں ہوتے۔ بھرائی دور کا کوئی حادثہ یا ہنگامہ حاس ذہنوں کو نقصان نہیں پہنچاتا۔ بلکہ غیر محفوظ حالات اور عدم تحفظ کے دور میں عظیم روحلانی قوتیں ایک جھنکے سے بیدار ہو جاتی ہیں۔ حاس ذہنوں کے مالک، طاقتور اور جاندار مشکر، شاعر اور فنکار، خطرے کی فضا کو اچھا سمجھتے ہیں، کیونکہ ان کے ذہن بڑے اور دقیق تجربات کے باعث پختہ ہوتے ہیں، اور انہیں نیا معیار ملتا ہے۔ وہ زندگی کے بارے میں زیادہ آزاد اور قابلِ انتہار فیصلوں تک پہنچتے ہیں۔ اس کے بر عکس مکمل طور پر ساکن ماحول میں، ذاتی زندگی کے مفادات اور خوشیں تخلیقی ذہنوں کو چمن لگا کر کمزور کر دیتی ہیں، اور ان کی عظمت چمن جاتی ہے۔ اس صورت میں محض خام خیالی اور بے غرض قابلیت والے لوگ آگے بڑھ آتے ہیں، اور ان کے نزدیک فن، نگر اور ادب محض ایک تجارت اور سوداگری ہوتی ہے، کیونکہ وہ ہوتے ہی تاجر اور سوداگر ہیں۔ ایسے لوگ بغیر کوئی دکھ اٹھائے اپنی البت سے کہیں زیادہ بڑے ذاتی فائدے حاصل کرتے ہیں، کیونکہ ان کے اندر آگ کے بھڑک اٹھنے کی قدرت ہی نہیں ہوتی، نہ ان میں بیان لیاقت ہی ہوتی

ہے۔ یقین ہے کہ کسی بھر ان صورت حال میں ایسے سطحی اور چھوٹے لوگ تھے کی طرح حیرت بن جاتے ہیں۔ بھر انوں میں یگانہ صفات کے مالک اور عظیم لوگ ہی ملتی ہوئی زندگی میں جان ڈال دینے والی تحریکوں کی محک، واضح نشان، یا اطمینان بن کر ابھرتے ہیں۔ ان کے وجود سے ہی تاریک کے ان ادوار کو شان و شوکت نصیب ہوتی ہے، اور یہی شان و شوکت قرض کی صورت میں آئندہ نسلوں کو منتقل ہو جاتی ہے، ماضی کا حال کے کھاتے میں پیاس سے زیادہ یہ قرض کبھی کم نہیں ہوتا ہیشہ بڑھتا ہی رہتا ہے، ایک سدا جاری رہنے والا سلسلہ، ایک سدا چلنے والا رستہ۔ اسی یادداشت کو تاریخ کرتے ہیں۔

اس راستے سے انسانی ذہن کو اپنی اہمیت کے شعور کا احساس ہوتا ہے، اسی راستے سے ہی انسان اپنی عظمت اور جوہر سے آگاہ ہوتا ہے۔ انسان، تمذب کے راستے میں مدد سے آگے بڑھتا ہوا، تمام اشیاء کا ازلی مرکز، دکھ سنبھالنے والا، آگے نمکھ رکھنے والا، جدوجہد کرنے والا، محنت کش۔ آج بھی وہ ایسا ہی ہے جیسا کل تھا، اور ہیشہ وہ ایسا ہی رہے گا۔ یہ حقیقت ہمیں ہیشہ یاد رکھنی چاہیے، درنہ دوسری صورت میں ہم اپنے اعلیٰ روحاںی درٹے کی اہمیت کی قدر و قیمت نہیں جان سکیں گے۔

شاہ، سچل اور سامی، عظمت کے حقیقی مفہوم میں، سندھی سماج کے عظیم انسان ہیں۔ وہ سندھی سماج کے ایک بڑے بھر انی دور کی پیداوار ہیں وہ ذہنی (روحانی) دنیا کے عظیم تخلیق کار ہیں۔ وہ بے مثال صلاحیت اور الہیت کے مالک، سندھی سماج کے نئے جنم کے نقیب ہیں۔ وہ مفکر، شاعر اور فنکار بھی تھے۔ دوسروں کے لئے جینے، اور مفارعہ کے لئے سرگردان رہنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی پوری زندگی ایک ہی مقصد اور نصب العین کے لئے وقف کر دی تھی۔ انہوں نے اپنے عہد اور اپنی دنیا کی کچی امنگ اور روح کو سمجھا۔ انہیں معلوم تھا کہاں اہل سندھ کیا چاہتے ہیں، ان کی زندگی میں کیا ضروری، اہم اور بنیادی باتیں ہیں۔ انہوں نے لوگوں کو صحیح راستہ دکھایا۔ وہ راستہ جس پر انہیں ہیشہ کے لئے چلنا ہے، آگے بڑھنے کا اور سلامتی کا راستہ، جس کے علاوہ

کوئی دوسرا راستہ ان کی سلامتی کے لئے ممکن نہیں۔ وہ اپنے ساتھ کوئی خواب، کوئی نظر، اور طرز حیات لے کر آئے تھے، جو کہ ان کے ملک، قوم اور سماج کے لئے آب حیات تھی ہی، پر وہ تمام عالم انسانی کے لئے بھی خیر و برکت، سکھ اور عافیت کا ایک پیغام اور کامل نہیں تھے۔ شاعر اور فنکاروں کی ایک عادت ہے کہ وہ جن چیزوں کو کچھ اسلوب کے باعث اہم سمجھتے ہیں دامتہ دے کر لافانی بنانا چاہتے ہیں۔ عظیم لوگوں کو اپنے بعد آنے والی نسلوں کی کوئی خبر تو نہیں ہوتی لیکن ان کا انہیں کوئی خیال بھی ہوتا ہے اس سلسلے میں بھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جبکہ وہ اپنے عمد کے ساتھ وابستہ ہیں اور اس کی روح سے آشنا ہوتے ہیں، اس کے اصل دکھ کی بنیاد کو جانتے ہیں اور اس کو اپنے روح کی اتحادگرائیوں میں وہ محسوس کرتے ہیں، اور پھر اپنے ان عمیق اور انمول احساسات کو دامتہ دے کر لافانی بنادیتے ہیں اور اپنے ملک، قوم اور سماج کے لئے اور ان کے توسط سے تمام دنیا کے بعد ان کے وہ احساسات ہیں دوا کا کام دیتے ہیں۔

شاہ، سچل اور سامی بھی اپنے ملک اور قوم کے ایسے ہی حکیم اور رہنماء ہیں۔ انہوں نے سندھی سماج کی مجبوری اور محرومی کو پہچانا جس نے اسے عصری بحراں سے دوچار کیا تھا، اور انہوں نے ان کے لئے نجات کی راہ تجویز کی۔ سندھی سماج کو اپنے ان عظیم بزرگوں اور ہمیشہ زندہ رہنے والے رہنماؤں کے معین کردہ راستے کو پہچانا ہے اور اس پر چلنا ہے۔ ممکن ہے بلکہ یقین سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ سندھی معاشرہ اس راستے پر مکمل طور پر نہ چلنے اور اسے چھوڑ کر دوسرے راستے کو اختیار کرنے کے باعث ہی آج اتنی اور اس قدر شواریوں میں بتلا ہے اور آج یا کل، جلد یا بدیر، لوث کر اس ہی راستے کو پہچان کر اور اسی رخ پر آگے بڑھتے ہوئے وہ خود کو پہچان سکتا ہے اور اپنی پہچان کر سکتا ہے، اور اپنے لیے اور منی نوع انسان کی لئے، خود کے ہونے یا نہ ہونے کی اہمیت کو سمجھ سکتا ہے، ثابت کر سکتا ہے اور منو سکتا ہے۔

شاہ، سچل اور سامی سندھ کی تاریخ میں ایک ہی دور سے تعلق رکھتے تھے بلکہ کم

و بیش ہم عصر شاعر تھے۔ چل اور سائی تو تقریباً ہم عمر بھی تھے۔ چل ۱۸۲۹ء میں اور سائی ۱۸۳۰ء میں پیدا ہوئے۔ چل نے تقریباً ایک سو سال کی عمر پائی اور ۱۸۲۹ء میں ان کا انتقال ہوا۔ سائی ۱۲۰ سال کی عمر میں ۱۸۵۰ء میں انتقال کر گئے۔ درازا اور شکار پور کے درمیان صرف دو دن کا پیدل سفر ہے، وہ اگر سواری استعمال کی جاتے تو ایک دن کا بھی سفر نہیں ہے۔ پھر ایک سو سال کی مدت تھوڑی مدت بھی نہیں جبکہ وہ عام آدمی بھی نہ تھے کہ ایک دوسرے کی باتوں سے ناواقف ہوتے۔ جب یہ دونوں ۲۲ سال کے نوجوان تھے شاہ کا انتقال ہو گیا۔ چل سرمت کے لئے تو شاہ عبداللطیف نے خود کا تھا۔ ”ہماری پکائی ہوئی ہندیا کا ڈھکنا یہ کھولے گا“ یعنی ہمارے پیغام اور خیالات و افکار کی وضاحت اور پرچار کرے گا۔ اپنے اس پیغام اور خیالات و افکار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، انہوں نے کہا کہ ”تو نے جسے ابیات سمجھا وہ تو“ آیات ہیں۔ اور یہ آیات ہی تجھے منزل مقصود تک لے کر جائیں گی، بالکل اسی طرح جسے ایران کے عظیم صوفی شاعر مولانا رومی کی مشنوی کے متعلق کہا گیا کہ ”یہ تو زبان میں قرآن ہے جس کا مغزا تنخواں سے الگ کر کے فارسی بولنے والی ایرانی قوم کی رہبری کے لئے اس کے سامنے لا کر رکھا گیا ہے۔“ پھر ساتھ ہی سائی ”ویدانت“ کا پرچار سندھی زبان میں کر رہے تھے گویا ایک طرف شاہ اور چل تھے، جو قرآن کی تفسیر و ترجمہ کے ذریعے ابل سندھ، ہندو اور مسلمانوں دونوں کی روحانی اصلاح کر رہے تھے، اور دوسری سائی تھے جو یہ کہہ کر کہ ویدن جو و پچار تو کھے سندھی میں سنایاں (آؤ میں، میں ویدوں کی حکمت تمہیں سندھ میں سناتا ہوں) ہندو مذہب اور اس کی مقدس کتابوں اور افکار سے سندھی سماج کو باخبر کرا رہے تھے۔ عربی اور سنسکرت زبانیں جن میں یہ مقدس صحائف ہیں، مشکل زبانیں تھیں اور ہیں۔ یہ زبانیں ہندو اور مسلمان دونوں کے لئے سمجھتا مشکل تھیں، اور اس سے زیادہ مشکل انہیں اپنے آسمانی صحیفوں کو سمجھنے میں ہو رہی تھی اس لئے کہ ان کی نظر میں تمام حق ان کے اپنے اپنے صحائف میں تھا، جن کا ایک ایک لفظ سچا اور برق

تحا، جس میں تبدیلی ناممکن اور ان پر حرف گیری منوع تھی۔ اسی دور میں انسی مقدس صحیفوں کے پیشہ ور سمجھانے والے (ملاء پنڈت) بھی موجود تھے جنہوں نے ان کی وضاحت اس طرح کی کہ سمجھانے والی بات کو گذرا کر کے اپنی مرضی اور مشاء کے مطابق قرآن، اور ویدا نت کے الفاظ کو توڑ مردڑ دیا۔ اور ایک دوسرے پر لعن طعن کر کے، سندھی سماج میں انسانی ہم اہنگی اور مفاہمت کے عوض تفرقی اور فساد کا سبب بنے رہے۔ ان میں سے ایک گروہ نے ریاست پر قبضہ کر کے اس کی طاقت کو اپنے ہتھیار بنا کر چاروں طرف ذہنی پستی اور گھٹھن کی دنیا قائم کر رکھی تھی۔ شاہ، چل اور سامی سندھی سماج کو اس تفرقی و فساد اور ایسی روحانی گھٹھن اور پستی سے بچانا چاہتے تھے، اور سندھ سماج میں امن و اتحاد، ذہنی آسودگی، اور ضمیر کی آزادی کی دنیا آباد دیکھنا چاہتے تھے، نئی دنیا کے اس حسین خواب کی محکیل کا احساس اور بے دھڑک جوش نے انسیں تمام عمر مضطرب اور کوشش رکھا، اور وہ اس کے لئے اپنے وقت سے اپنی تمام توجہ کے ساتھ اپنے ناتا نبھا کر انسانی تہذیب کے اسی ایک بہترن اصول کو سمجھا کرنہ صرف سندھی سماج کے بلکہ بینی نوع انسانی کی تاریخ میں عظیم اور امر انسان بن گئے۔

لوگ کیسے اور کب ریاست بن جاتے ہیں اور کیسے اور کب قوم بن جاتے ہیں، انسانی تاریخ کا یہ انتہائی بنیادی اور گھبیر سوال ہے۔ ویسے تو ملکوں، معاشروں اور قوموں کی غلامی کے زمانے مجموعی طور پر ان کی زندگی کے بھرائی دور ہوتے ہیں، کیونکہ ان ہی ادوار میں ان کا وجود خطرے میں ہوتا ہے اور وہ آزمash میں جلا ہوتے ہیں، لیکن خاص طور پر جب وہ اپنی آزادی کی جدوجہد میں مصروف ہوتے ہیں ان کی تاریخ کے بنیادی طور پر بھرائی اور اہم ترین ادوار وہ ہی ہوتے ہیں۔ شاہ، چل اور سامی کا دور (تفربا ۱۷۰۰ سے ۱۸۵۰ء) اسی طرح سندھی سماج کی تاریخ کا اہم ترین اور بنیادی طور پر بھرائی

دور تھا۔

نویں صدی کے نصف سے لے کر سولہویں صدی کے شروع تک کم و بیش سات

سو سال تک سندھی ریاست سندھیوں کے قبضے میں رہی۔ پانچ سو سال سے کچھ زیادہ سو مرد خاندان کے ہاتھ میں اور تقریباً دو سو سال سہ کے قبضے میں رہی۔ سندھی تاریخ کا یہ عمد سندھی معاشرے کی بنیادی نمودار دور تھا۔ سندھ کے تقریباً تمام تاریخی اور نیم تاریخی قصہ، قابل فخر و اعماق، کتھائیں، لوک کہانیاں، لوک گیت، اور قابل تحسین سورما اسی آزاد ریاستی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ سندھی تاریخ کے اس دور کو بجا طور پر سندھی معاشرے کے تمذیبی غلبے کا ترجیحی دور کہا جاسکتا ہے۔ اس عمد کے سندھی سماج میں مذہب اور ریاست دونوں نے سندھی تمذیب کی نشوونما کا کام انجام دیا۔ ملک کی سرحدوں کی حفاظتی تدبیر، معاشرتی خوشحالی کی کوششیں، سندھی کردار کی ذہنی پرورش اور اخلاقی تعمیر و تحریک، سندھی معاشرے کی تاریخی مشکل اور ساخت جو اس دور میں بنی اس کی مثل سندھ کے تاریخی ادوار میں کوئی اور نیسیں ملتی ہے۔ سندھی تاریخ کا یہ غیر معمولی اہمیت کا حامل دور ۱۵۲۰ء میں ختم ہو گیا۔ اس کے یوں ختم ہو جانے پر اہل سندھ نے اپنا قیمتی خون بھایا۔ جس میں سندھی معاشرے کے ہر طبقے کا خون شامل تھا۔ عظیم مقصد کے حصول کی خاطر قربانی کے طویل سلسلے میں انہوں نے ایک بالکل ہی نادر اور انوکھے مثل کا اضافہ بھی کیا، جو کہ ان کے ایک ولٹن دوست مذہبی عالم مخدوم بلاول کی شادت کا مثل تھا، جنہوں نے دشمن کے ہاتھوں کو لھو میں پس کر اپنی جان قربانی دی۔ ماضی میں بھی سندھ کے مذہبی قائدین نے ولٹن عزز کے لئے ایک موجہ اپنے سر دیئے تھے۔ ۳۲۵ قبل مسیح میں جب یونان کے سکندر اعظم اپنی لڑکے فوج سمیت سندھ کی حدود میں داخل ہوا تو اسے کسی نے بتایا کہ وہاں ایک الیسی موجود ہے جو بیرونی حملہ آوروں کے خلاف مقابی لوگوں کو منظم کرتے ہے۔ وہ برہمن تھے جو مقابی لوگوں کے ساتھ خود بھی قربانی سے دریغ نہ کرتے تھے۔ دو واقعات تاریخ میں موجود ہیں۔ ایک واقعہ سہ قبیلے کی ریاست سندھ میں (سیوہن) ہے، جہاں لڑکے بعد سکندر اعظم نے برہمنوں کے قتل عام کا حکم دیا کیونکہ ”ا-

علوم یہ تھا کہ انہوں نے ہی لوگوں کو مقابلے کے لئے ابھارا تھا۔ ”دوسرادا اقہ ماسیکانس (ماچھی) قبیلے کی ٹکست خورده راتا کا ہے جسے ”اس کی ریاست لور کے چورا ہے پر تمام ہمنوں کے ساتھ پھانسی پر چڑھانے کا حکم دیا گیا کیونکہ انہوں نے ہی اسے مقابلے کے لئے آمادہ کیا تھا۔“ لیکن ان بے مثل قربانیوں کے باوجود بھی سندھ کی الگ الگ یا تیس نہ یوتانیوں کے حملے سے محفوظ رہیں اور نہ ہی دو ہزار سل بعد ایک سہ جام زیر حکم سندھ کی مرکزی ریاست ہی ارغون و حشی حملہ آوروں سے نج سکی۔

کوئی بھی سماج، ملک اور قوم بیرونی حملہ آوروں سے ٹکست نہیں کھا سکتی اور ٹکست کھانے کے بعد زیادہ عرصہ مجبور اور محکوم نہیں رہ سکتی جب تک کہ اس میں اندروںی کمزوری یا نقص نہ ہو۔ اور وہ کمزوری یا خرابی یقیناً ”اس کے اندروںی نفق اور انتشار کی کوئی صورت یا نتیجہ ہو گئی۔ ریاست، مذہب اور تہذیب معاشرے یا سماج کے یہ تین شعبے، سماج کی سلامتی یعنی اس کے اتحاد اور مضبوطی کے ضامن ہوتے ہیں۔ بلکہ ان کا منصبی کارج ہی یہ ہوتا ہے۔ ریاست اپنا یہ کارج ملک اور سماج کی حفاظت کرنے سے، اور فرد واحد کی پسند نہ پسند کو اجتماعی پسند نہ پسند سے ملا کر ایک بنانے سے، قانون اور انصاف کے پورے نfat سے، طبقات اور گروہوں کے سلسلے میں اپنی غیر جانبداری کو قائم رکھتے ہوئے ان کے درمیان باہمی برداشت اور رواداری کی فضا قائم کرنے سے، ادا کرتی ہے۔ تہذیب اپنا یہ کارج ذہنی تخلیقات یعنی فلسفہ، شاعری اور دوسرے فنون لطیفہ کے میدانوں میں اپنی کوششوں اور جسمانی مشقت کی وسیع پیداواری، اور تعمیری کوششوں کے ذریعے ادا کرتی ہے۔ لیکن چونکہ مخصوص ریاستیں اور مذاہب صرف چند افراد (یا گروہوں) کی ذاتی کوششوں اور چند مخصوص و اتعات کا فوری نتیجہ ہوتے ہیں اور دوسری بات یہ کہ ریاست اور مذہب اپنے زور اور عقیدہ (طااقت اور ایمان، اقتدار اور اعتقاد) کے گھمنڈ میں عدل اور رواداری کے توازن سے اکثر باہر نکلے ہوئے ہوتے ہیں، اسی لئے وہ سماج میں امن و اتحاد کا ذریعہ بننے کی بجائے ان کی تفرقی

اور نفاق کا سبب بن جاتے ہیں۔ خاص طور پر جب وہ محض ایک دوسرے کی دیکھی میں یا غلامی میں ہوتے ہیں، تبھی تشدد اور تعصب سے تمام معاشرے میں فساد کر دیتے ہیں۔ یوں وہ معاشرہ ظاہری طور پر مضبوط اور مستحکم نظر آتا ہے، لیکن بیرونی دشمنوں کے مقابلے میں کمزور اور زیر دباؤ رہتا ہے۔ ریاستوں اور مذاہب کے بر عکس، تہذیب طویل زمانوں کے گزرنے سے قوموں اور سماجوں کے ذہن کے کھلنے، پختہ ہونے اور قدم بقدم آہستہ آہستہ رونما ہونے والی ترقی و ارتقا کی پیدوار ہوتی ہے، اس لئے تہذیب اپنی عمل پر ای میں کبھی بھی اپنے سماج کے نفق یا تفرقہ کا باعث نہیں بنتی، بلکہ ہمیشہ اس کے اتحاد اور مضبوطی کے لئے صاف سحری اور پختہ راہ فراہم کرتی ہے اسی لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ریاست اور مذہب کے بغیر بھی کسی قوم یا معاشرے کے وجود کا بلا خر تصور ممکن ہے، پر تہذیب کے بغیر وہ کسی بھی صورت میں ممکن نہیں ہو سکتا۔ کوئی ریاست اور کوئی مذہب جب کسی قوم یا سماج کی تہذیب کے دفاع اور فروغ کی کوشش میں مصروف ہوتے ہیں یا کم از کم اس سے ہم آہنگی یا مصلحت میں ہوتے ہیں، تب اور صرف تب ہی وہ اس قوم یا معاشرے کی قدر اور فرانزداری کے حقدار سمجھے جاتے ہیں۔ کیونکہ صرف اسی صورت میں وہ اس کے وجود کے بھی خواہ، مدد مگر اور محافظ بن سکتے ہیں۔ اسی خیال کے تحت ہر ریاست کو اور ہر مذہب کو بھی اپنی قومی حیثیت اور خاص معاشرتی رنگ کو اختیار کرنا پڑتا ہے۔ بدھ مت نے چین، چانپ اور بربا اور دوسرے مشرق قریب کے ممالک میں سے تقریباً ہر ملک میں مقامی سماجی رنگ اختیار کیا جو اس کا قومی رنگ تھا۔ میسیحیت نے یونان، روس ایشیائی کوچک اور خاص طور پر سولھویں صدی کی اصلاحی تحریک کے بعد یورپ کے تقریباً ہر ملک میں مقامی رنگ اختیار کیا جو اس کا قومی رنگ تھا۔ قوم عرب کے بعد ایران نے اسلام قبول کیا اور اسے خاص ایرانی رنگ دے کر اپنا قومی مذہب بنایا اور اس طرح اپنے سیاسی اور تہذیبی امتیازات اور خویختاری کو بحال کیا اور قائم رکھا۔ میں الاقوامی تاریخ میں ایسی کئی

میں موجود ہیں کہ جب اقوام اور معاشرہ کو اپنے فاتحین کے مذہب کو ملتا اور اپنا پڑا، تو اسے اپنی مقامی حالت اور حیثیت سے ہم آہنگ کر کے اپنے تذہبی غلبے کا ریگ دے کر اپنا بنایا۔ اسے بدعت یا تجدید کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ حقیقتاً بدعت تا تجدید سے کوئی "قومی" مذہب بھی بچا ہوا نہیں ہے کیونکہ کوئی بدعت کوئی تجدید میں کسی مذہب میں صرف اسی صورت میں ہی آتی ہے۔ جب وہ اپنے تعصباً اور جمود کے باعث اپنے قوم اور معاشرے کی آزاد اور متحرک تہذیب سے قدم بقدم نہیں رہ سکتا، بلکہ اس کی راہ کی روکوٹ بن جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ ریاست اور مذہب کو اپنی رضا سے یا مجبوراً بہر صورت اپنی ہم عصر یا طفیلی ہو کر رہتا پڑتا ہے اور اسی صورت میں سماج کے یہ تینوں شعبے ہم آہنگ رہ سکتے ہیں اور اس کے اتحاد اور مضبوطی کی صفائت بنتے ہیں۔

ہیس سو سال پہلے یونانی حملے کے وقت اہل سندھ قوم تو درکنار، ریاست بھی نہیں بن سکے تھے۔ وہ قابلی نفاق میں باتلا تھے۔ ان کے متذکر بلا دو قابل ماسیکانس (ماچھی) اور سمس (سمہ) کے علاوہ اس کی تاریخ میں پانچ دوسرے قابل کے نام بھی آتے ہیں، جو سب علیحدہ علیحدہ تھے، اور علیحدہ علیحدہ ہو کر لڑے، بلکہ اس وقت بھی وہ آپس میں متصادم رہے اور علیحدہ علیحدہ مارے بھی گئے۔ ان کا دھن دوست مذہب اور علیحدہ علیحدہ ریاستیں بیرونی حملہ آوروں کے بامقابل کسی کام نہ آئے۔ عربوں کے حملے کے وقت اہل سندھ کے پاس اپنی ریاست تو تھی، لیکن جس زور سے پہ دو قائم کی مگنی تھی اسے وہ اپنی قوت نہ بنا کے تھے۔ یعنی اہل سندھ خود کو ابھی قوم نہیں بنائے تھے۔ خاص طور پر مذہبی تفریق ان کی اندرونی زیوں حالی کا سبب بنتی ہوئی تھی۔ بدھ مت اور برہمن داد، اپنی اپنی خود پسندی اور اپنے اپنے تعصبات کے باعث ایک دوسرے پر نگاہیں جائے بیٹھے ہوئے تھے۔ اور چھوٹی چھوٹی راج دھانیوں کے چھوٹے چھوٹے ہاں سردار، کچھ اعتقد ای محمد، خوف اور کچھ اقتدار کی کشش اور خواہش میں

اپنی اپنی مختصر حکمتوں کا شکار ہو گئے۔ یوں سندھ کی مرکزی ریاست اپنے مذہبی اور سیاسی نفلق کے باعث اندر سے کھائی ہوئی کھوکھلی دیوار بھی موجود رہی جسے باہر سے صرف ایک ہاتھ دکھانے کی دیر تھی۔ سولہویں صدی کے شروع میں ارغونوں کے حملے کے وقت سندھ کا حکمران شاہی گھرانہ ایک بار پھراقتدار کی خانہ جنگی میں مشغول تھا۔ اور سندھ کی ریاست اپنی طاقت اپنے ہی خلاف استعمال کر رہی تھی۔ ریاستی سربراہ جام نیروز سندھ کی عالی مقام جام ننده کے پیروں سالی کا نالائق بیٹا اپنے اور پرانے لوگوں کے خوف میں بتلا، خود سے بیزار، ذاتی اور عوامی مفاد سے بے نیاز صرف اپنے ذاتی بچاؤ کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اور اس جدوجہد میں کبھی اپنے لوگوں کے ساتھ کبھی دوسروں لے ساتھ مل کر سندھ کی نگفت اور خواری کا سبب بن گیا۔ ہم مذہبی کا چونخ پہنے حملہ آور ہونے والے ارغونوں سے میکل میکل نہ وہ خود مقابلہ کر سکا، تاہی اس کے بزرگ اتالیق دریا خان اور اس کے بہادر بیٹے کچھ کر سکے۔ اور تاہی اس کے تحت دُمچ کے دعویدار چھیرے بھائی جام صلاح الدین مشترکہ دشمن سے نبرد آزمہ ہو سکے۔ اور اس طرح مرکزی حوصلہ افزائی کے قطعاً عدم موجودگی میں سندھ کے لوگ اپنے وطن کو دشمنوں سے نہ بچا سکے۔ وطن کے دفاع کی اس عبرتاںک جنگ میں سندھ کا ہر طبقہ اور ہر قبیلہ ایک ایک کر کے لڑتا رہا، اس میں ان سے شامل وطن دوست مذہبی حصہ بھی انہیں بچا نہیں سکا۔ دراصل یعنی اس آزمائشی دور میں مذہب، ریاست (حکومتی اقتدار) ہی کی طرح، اہل سندھ کے اتحاد اور قوت کا نہیں بلکہ اس کی کمزوری اور نفلق کا سبب بن گیا۔ قاضی قافن اور ان کی ساری مددوی ثولی کے مذہبی سربراہان، شمالی سندھ کے مرکزی شرکھر کے سادات اور دوسرے کتنے ہی شیخ، مبلغخ نے اپنے وطن اور اپنے لوگوں سے غداری کی اور حملہ آور دشمنوں کے لئے جاسوسی اور روحانی زکاریوں کا ہر اول گروہ اس کے علاوہ تھا۔ مطلب یہ کہ سولہویں صدی کا سندھی ماشرہ اپنی مضبوط تمذہبی روایتوں کی موجودگی میں اور پختہ محب وطن ریاست رکھتے

ہوئے بھی صرف اپنی اندر ورنی کمزوری کے ہاعث جس کی بنیادیں سیاسی اور مذہبی خلق شار میں تھیں خود کو نگست اور غلامی سے محفوظ رکھ سکے۔

ارغونوں کے ہاتھوں سندھ کی اس فتح کو "خرابی سندھ" کہہ کر اس دور کے عالموں نے اس سے سندھ کی بربادی کی تاریخ (۱۹۲۷ء ۵۲۰ھ) نکالی ہے۔ "تاریخ مخصوصی" کے مطابق بارہ محرم کو ارغونوں کا لشکر ٹھیٹے میں داخل ہوا اور "مغل ۲۰ تاریخ تک سر میں لوٹ مار کرتے رہے اور وہیں کے لوگوں کو زلیل کرتے رہے جس سے آیت مقدسہ ان الملوك لاذ ادخلو اقیریته افسروها (بلوشہا جب کسی شر میں داخل ہوتے ہیں تو اسے دیران کر دیتے ہیں) کی وضاحت آنکھوں کے سامنے آگئی۔" جب دشمنوں کے لشکر نے ٹھیٹے کا شر فتح کیا، تو اسی تاریخ دان کا کہنا ہے "تمن دن ٹھیٹے میں رہ کر مغلوں نے اس کے کینوں کو تباہ برباد کر دیا۔" باغیل (موجودہ سون بوک علیے کی اراضی) میں پہنچ کر ارغون افواج نے "ماچھی قوم" جنوں نے اطاعت اور فرمانبرادی سے انکار کر دیا تھا، ان سب کو قتل کیا اور ان کے مل و اسباب اور مویشیوں کی لوٹ مار کر کے گھروں کو قلعوں کو سمار کر دیا۔" سندھ کے بلوچوں کے بارے میں سندھ کی فاتح شاہ بیگ ارغون، جن کے متعلق تاریخ مخصوصی کا کہنا ہے کہ "اکثر اوقات وہ عبادت اور تقوے میں مشغول رہتا تھا اور علماء و مشائخ کی مجالس میں جاتا تھا۔" اور مرنے کے بعد جس کی لاش کہ شریف کے جنت المعلی میں دفنانے کے لئے پہنچائی گئی۔ اس نے اپنے گروہ سے "صلح و مشورے کے بعد فیصلہ کیا کہ اس قوم کی آنکھ کو ٹکوار کی دھار سے بجھانا چاہیے۔ پھر طے یہ ہوا کہ ہر گوٹھ (گاؤں) میں تجربیکار لوگوں کی ایک جماعت بھیجی جائے جو کچھ مدت ان لوگوں کے درمیان رہنے کے بعد ایک مقررہ وقت پر ان پر حملہ کر کے انہیں ختم کر دے، اس طرح ہر آبادی کے لئے ایک جماعت مقرر کی گئی جو مقررہ وقت کے انتظار میں رہی اور جب وقت آیا تو اپنی ٹکواریں نکل کر اس بدجنت قوم کو ختم کر دیا۔ اس طرح ایک ہی وقت میں بلوچوں کی ۳۲ آبادیوں کے

لوگوں کو قتل اور برباد کر دیا گیا۔ ۱۵۲۷ء جنوری میں ایک سل کے گھیرے کے بعد ارغون جب ملتان کے قلعے کو توڑ کر اندر شر میں داخل ہوئے تو داخل ہوتے ہی نہایت بے دردی سے قتل و غارت گری اور لوٹ مار شروع کر دی۔ سات سل سے لے کر ۷۰ سل تک کی عمر کے لوگوں کو قید کیا اور ملتانیوں پر قیامت بڑا ہو گئی۔ کچھ لوگوں نے بزرگوں کی خانقاہ میں پناہ لی، لیکن دس بارہ دن شر میں لوٹ مار مچانے کے بعد جب ”ترخان“ نئی افواج لے کر وہاں پہنچا اور پناہ گزشوں کو جان سے مار کر خانقاہوں کو آگ لگادی اور دیواروں کو خون سے رنگ دیا۔ ۱۵۳۸ء میں مرتضیٰ شاہ حسن، ہمایوں کے بلانے پر گجرات گئے۔ ٹپن کے آس پاس قیام کیا اور اس کے ایک پہ سلاں سلطان محمود نے احمد آباد پہنچ کر گجراتیوں کا مال و اسباب لوٹا جس میں بڑی تعداد میں سامان کپڑا نقدی اور سوٹا ملا۔ گجرات سے شاہ حسن نے ”رادھن پور“ کے راستے سے واپس آتے ہوئے جاڑبجہ اور سوڈھا قبائل کا قتل عام کیا اور لوٹ مار کر کے ان کو برباد کیا۔ اسی مرتضیٰ شاہ حسن کے لیے بھی وہی ”تاریخ معصومی“ کہتی ہے کہ ”جو بھی مقدمات ان کے پاس پیش ہوئے تھے، وہ اس سلسلے میں شرع سے رجوع کرتے، سادات، مشائخ اور علماء کا بے حد احترام کرتے تھے۔“ اور ان کی جسد خاکی کو بھی مدین کے لئے مکہ مکرمہ لے جایا گیا جدل آپ ”جنت المعلی“ کے قبرستان میں اپنے بلپ کے پہلو میں دفن ہوئے۔

تاریخ کی یہ عالم آشکار حقیقت ہے کہ مذہب کسی ملک، قوم یا سماج کو کسی دوسرے اور ملک، سماج اور قوم کی پیش قدی، لوٹ مار غلامی سے بچانے کا کام نہیں رہتا چاہے پیش قدی اور لوٹ مار کرنے والی قوم ہم مذہب قوم ہی کیوں نہ ہو۔ مذہب کسی ایک قوم کو دوسری قوم پر حملہ کر کے لوٹ مار کرنے اور غلام بنانے سے روکنے کا کام نہیں رہتا۔ چاہے دوسری قوم ہم مذہب ہی کیوں نہ ہو۔ پیش قدی لوٹ مار اور بلا دستی یہ اجتماعی طاقت، اس کے انتظام و استعمال کے سائل ہیں۔ یعنی یہ ریاست کے عملہ دائرہ کار میں آتے ہیں۔ خالص مذہب (کسی بھی مذہب) کا یعنی کسی بھی نظریہ میں

ایمان اور اعتقاد کا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ بلکہ اکثر ایما اور اعتقاد، کمزور اور امن پسند قوم میں جاسوس، غدار اور "پانچویں کالم" کے لوگ پیدا کرتا ہے، جن کو اسی عقیدے والی طاقتور اور جابر قوم اپنے جنگی مقاصد کے لئے استعمال کرتی ہے۔ سندھ کی تاریخ نے محمود غزنوی کے منصورہ پر حملے اور اس کو نیست و نابود کرنے سے لے کر اور خاص کر ارغونون کے حملے سے لے کر ۷۸۳ء میں مغلوں کے دور کے اختتام تک اور پھر نادر شاہ، احمد شاہ عبدالی، مدد خان اور شاہ شجاع کے حملوں کی صورت میں اسی بنیادی حقیقت کا حلم کھلا ثبوت فراہم کیا ہے۔

قریب قریب پون صدی ارغونون، اور ان کے شریک کار ترخان قبلیے کے مغل، اپنے ہم مذہب سندھیوں کو سچلتے رہے لوٹتے رہے۔ اس دوران انہوں نے گوتا سے عیسائی پر سمجھیز غنیم کو بلوا کر بھی ٹھنڈھے کو لٹوایا، شر کو آگ لگوائی اور قتل عام کروایا۔ آخر کار ۱۵۹۱ء میں سندھ کو براہ راست دہلی کے مغلوں نے اپنی شاہی جاگیر بنا لیا۔ وہاں کے سب مغل بادشاہ خود کو "غازی" کہلواتے تھے، اور بعد مرگ "خلد آستانی عرش آشیانی" وغیرہ کہلوائے۔ انہی کے دور افتخار میں غلام سندھ کی مسلمان رعایا کا جو حال تھا وہ بھی قابل سماعت ہے۔ جہانگیر نے اپنی "تذکرہ" میں اپنے ٹھنڈھے کے نواب "مرزا رستم" کے لیے لکھا ہے کہ "اس نے لوگوں پر ایسے بے تحاشا ظلم ڈھائے کہ چاروں طرف خوف و ہراس پھیل گیا۔ اس کی دوسری بہت سی خامیاں بھی سننے میں آتی ہیں۔" اس کے ایک اور مغل نواب فوج علی کے بارے میں جو بکھر کے زیر انتظام حکومت کی ایک جاگیر کا حاکم تھا۔ "ذخیرۃ لخوانین" میں بیان کیا گیا ہے کہ "اس کے ہیں پانی کی دو کڑاہیں جلتی آگ پر رکھی ابتدی رہتی تھیں اور جو بھی چور یا سادھ، ظالم یا مظلوم، قصور دار یا بے قصور ہاتھ لگتا، اس کے ہاتھ پاؤں بندھوا کر ان کڑاہیوں میں پہنکوا دیتا تھا۔ جو وہیں پر اس میں جل کر مر جاتے۔ تقریباً ایک ہزار لوگ اس خطے میں اس طرح ہلاک کر دائے۔ کینگی اور لاپرواہی میں اس شخص جیسی اور مثال نہیں

لئی۔ ” شاہ جہان کے دور حکومت کے ایک نواب احمد بیگ، جس کی راجدھانی سیون تھی، کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ ایک انتہائی ناامل، سست اور کابل شخص تھا جس نے اپنی حکومت کی باغ ڈور اپنے ایک ظالم اور سفاک بھائی مرزا یوسف کو سونپ دی تھی۔ جو فطری لحاظ سے انتہائی پست، ذلیل، بے رحم اور بے ہودہ شخص تھا..... وہ اتنا سفاک تھا کہ حجاج بن یوسف جیسا ظالم بھی اس کے سامنے ایک ادنی شاگرد کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس نے اپنے ظالم اور کثھور پن سے پورے صوبے کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ روزانہ شر کے بے قصور لوگوں کو پکڑوا کر انہیں اتنے کوڑے لگواتا کہ آکھر کی کھل اتر جاتی اور وہ مر جاتے۔ یوں دو تین سو بے گناہوں کا مرنا اس کے لئے روزانہ کا معمول تھا۔ صوبے میں جس بھی مالدار شخص کے بارے میں اس کو علم ہو جاتا تو اس پر تھمت لگا کر اپنے پاس بلواتا، پھر معمولی سوال جواب کے بعد اسے کوڑے لگواتا پھر اس کا مل داسلب ضبط کر لیتا۔ اس کا یہ سلوک صرف مردوں تک محدود نہ تھا بلکہ مالدار عورتوں کے ساتھ بھی یہی سلوک روا رکھتا۔ پورے علاقے میں جس کے پاس بھی قیمتی اور بہترن اونٹ رکھتا اس سے جری چھین لیتا اور اپنے شہنشانے میں داخل کر لیتا۔ راستوں کی ہر منزل پر اور دریاؤں کے ہر گذر گاہ پر اس نے اپنے کارندے کھڑے کر دیئے تھے جو ہر آنے جانے والوں سے بے سبب ہی جرمانے اور محصول کے نام پر پیسے اشیختے، یہیں تک کہ خالی خولی راہ گیر بھی ان کے ہتھ کنڈوں سے محفوظ نہ تھے۔ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک جانے کے لئے بھی راہداری لینی ضروری تھی جس کے لیے روپے ادا کرنے پڑتے تھے۔ اگر کسی کو اپنے کسی رشتہ دار کے انتقال کی خبر دور دراز کے رشتہ داروں کو کرنی ہوتی تو وہ بھی بغیر پیسے ادا کئے، اور راہداری لئے بغیر ایک قدم باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ دریا میں خالی کشتیوں پر بھی محصول واجب الادا تھا، سو اگر وہ کی مل بردار کشتیوں اور جہازوں پر ہر طرح کی مصیبتوں نازل ہوتی تھیں۔ کئی دنوں تک ان کو بلا وجہ روکے رکھا جاتا ہاکہ وہ یا اپنا سامان کوڑیوں کے مول

یہون میں بچیں یا سو اگر تجھ آکر اپنی جان چھڑانے کے لئے مرزا یوسف کو بھاری رشوں اور قیمتی تحائف نذر کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ پورے ملک کے چوروں اور ڈاکوؤں کو اس نے اپنے پاس پناہ دے رکھی تھی اور ان سے ملک میں چوری کرواتا، ڈاکے ڈلواتا تھا۔ بنگل سے نامی مگر امی جواری بلوا کر انہیں شر کے چوراہوں پر تعین کیا، جو راہ کیروں کی نہ صرف جیبیں خالی کرتے بلکہ ان کے جسم کے کپڑے تک داؤ پر لگا دیتے۔ چوری اور جوئے کی آمنی ہر شام باقاعدہ حلب کے ساتھ خزانے میں جمع ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے ایک نئے قلعے کی تعمیر کا منصوبہ بنایا اور حکم صادر کیا کہ شر کے سب لوگ اپنے سروں پر ایسیں ڈھونیں گے اور اپنے ہاتھوں سے گارہ کر کے قلعہ کی دیواریں تعمیر کریں گے، اگر کوئی مزدور یا بوڑھا شخص اپنے ساتھ کرائے پر مزدور لے کر بھی آتا ہے تو یہ بات مرزا یوسف کو ناگوار گزرتی۔ یوں ہر ایک نے چاہے وہ کسی حال میں تھا، اپنے ہاتھوں سے بیگار کی۔ چغل خوروں کا ایک بڑا نولہ اس نے اپنے ہمراہ رکھا ہوا تھا جن کو وہ حقیقت دان کہتا اور وہ ملک کے گوشے گوشے میں خاص ہدایات کے ساتھ ہر سکھی اور کھاتے پیتے عزت دار شخص کو ذیل خوار کرتے اور کرواتے رہتے۔ فصل پک جانے پر مرزا یوسف کے خاص آدمی اس کی دانہ بندی اتنی بڑھا چڑھا کر کرتے کہ کسانوں کو لینے کے دینے پڑ جاتے اور پورا ادائیج دینے کے باوجود بھی ان کے اپنے چوپائے نیلام کرانے پڑتے تب جا کے جان چھوٹتی۔ اگر اپے مظلوم اور مجبور آباد کار اس ظلم سے تجھ آکر نقل مکانی کرتے تو مرزا یوسف کے کارندے گھوڑے دوڑاتے ہوئے انہیں آ لیتے اور ان کا مل داسباب لوث کر لے جاتے۔ مرزا یوسف ملک کے بااثر اچھے اچھے لوگوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکاتا اور لڑوata رہتا تھا تاکہ ایک طرف بااثر لوگ کمزور پڑ جائیں دوسری طرف ملک کی وحدت قائم نہ رہے اور یوں وہ ملک پر اپنی گرفت مضبوط تر کر سکے۔ اگر کچھ لوگ اس کے مظالم سے تجھ آکر فریاد کے لئے دبلي یا ملکن کا رخ کرتے تو اڑوں پڑوں

کے نواب اور چھوٹے چھوٹے حاکم۔ مثلاً ”بکھر، نصیر پور، تھٹھے“ کے نواب اور حاکم ان کو راستے ہی سے مرزا کے پاس واپس بھجوادیتے تھے وہ ان کی اچھی طرح خبر لے۔۔۔۔۔ یہوں کے علاقے کے اس نسلستان کے یہ واقعات خود وہاں کے ایک سرکاری واقع نولیں، یوسف میرک، نے مخفی طور پر قلبند کئے جو اس نے بعد میں ”مظہر شاہجمانی“ کے نام سے کتابی صورت میں ترتیب دے کر ۱۸۳۲ء میں مکمل کئے جس کا قلمی نسخہ اسی کے ہاتھ کا تحریر کردہ موجود ہے جو چھپ کر شائع بھی ہو چکا ہے۔ سندھ اور سندھ کے لوگوں کی اس بے کسی کی دکھ بھری داستان کو قلبند کرتے کرتے آخر یوسف میرک کے دل سے بھی ایک آہ نکل گئی جو اس کی کتاب میں درج ہے۔ جسے اختصار کے ساتھ وطن کے غلامی پر ازی تیرا ایک طرف تو دوسری جانب وطن دوست ریاست کے بنیادی سماجی کام کا ایک سچا اور جامع بیان شمار کیا جا سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

”کار ملک بجائی ریسید کہ ملک ناپر سان و ملک بیدا دان و ملک بیسان شد چون آدم لا ملک گراند، ہزار گونہ فساد دین و دننا پیدا میشود، چہا کہ مدار عالم وابستہ معاش است۔“

ملک، دین اور دنیا، یعنی ریاست، مذہب تندیب، اور عالم کا یعنی سماج کا دار و مدار معاش (گذر اوقات اس کے وسائل اور پیداوار) پر یعنی جب لوگ ریاست سے محروم ہو جاتے ہیں اور وہ جا کر ایسے لوگوں کے ہاتھ لگتے ہیں جو ان کو نہیں پوچھتے اور نہ ہی ان کی دادری کرتے ہیں اور وہ لوگ اس ریاست میں بے کس بن جاتے ہیں۔ یعنی ان کی معاش اور اس کے وسائل ان سے چھوٹ جاتے ہیں، تو نہ ان کا دین سلامت رہتا ہے، نہ دنیا، ان کا نہ ہب اور تندیب دونوں فلوں میں گھر جاتے ہیں اور ان کا سماج ایک حقیقی اور بنیادی نوع کے بھرمان کی لپیٹ میں آ جاتا ہے، ان پر اپنی زندگی کی آزمائش اور اپنے وجود کی بقاء کی آزمائش آ جاتی ہے، اور ان کے سامنے اپنی نجات کی کامل جدوجہد کے سوا اور کوئی راستہ نہیں پہچتا حتیٰ کہ بلا خودہ سماجی طور پر متعدد ہو کر از سر نوع مضبوط ہو جائیں اور اپنی محب وطن قومی ریاست قائم کر سکیں اور اس کے سامنے میں رہ کر

اپنی تمذبی یعنی ذہنی اور معاشی خوشحالی حاصل کرنے کے لئے ضروری تحقیقی اور پیداواری کام کر سکیں۔ اپنی محب وطن قومی ریاست کے زیرِ سلیہ خاص کر، اور دیے بھی اپنے آپ عموماً، کوئی ملک، قوم یا سماج تمذب کے میدان میں صرف معاشی طور پر کس قدر کوشش میں مصروف رہتا ہے، اور اس کی کوشش کے ثمرات غلامی میں کس طرح برباد ہو جاتے ہیں اس کی کئی مشالیں بھی ہمیں اپنی تاریخ میں ملتی ہیں۔

احمد بیگ کے دور نوابی میں یہون کے باغبان علاقے کی بربادی کا ذکر کرتے ہوئے "منظرشاہجمانی" کے مصنف "یوسف میرک" لکھتے ہیں۔ خانوادہ سمه کے دور اقتدار میں (یعنی تقریباً ایک سو سال قبل) یہ خطہ آبادی اور خوشحالی کے لحاظ سے درجہ کمل پر تھا۔ مخدوم جعفر بو بکانی نے مرزا عیسیٰ ترخان سے کا ذکر کیا تھا کہ جب پہلے پہل ۹۲۱ھ سے ذی القعده (۱۵۱۵ءی دسمبر) میں (جام مندہ کے زمانے میں) شاہ ارغون قد عار سے جب یہاں حملہ آور ہوا تو کم سے کم ایک ہزار اونٹ جو رات میں وہاں پر رہت پر کام کر رہے تھے انہیں زبردستی لے گیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ علاقہ دوسری باتوں میں کتنا خوشحال اور سر بز شاداب تھا۔ (اس کے علاوہ) سندھ کے والی جام مندہ کے دنوں میں اس نے اپنے ایک ہندو وزیر بہام چانگلہ اور دریا خان کو یہون بھیجا۔ جنہوں نے وہاں آکر آب باراں پر بننے والی ساواہ نام کی ایک نسرتیار کرائی جس کا پانی منجھر جمیل میں آکر جمع ہوتا تھا اس جمیل کے شہل میں مکاہا ہائی رعایا کھیتی باڑی کرتی تھی، اور اس کے جنوب میں بوک کے لوگوں حجج اور مانع کی ملاوٹ سے ایک پکا بند یا پشتہ تعمیر کیا جس کے ذریعے وہ کاچھے کی زمینوں تک پانی لے گئے جس کے باعث وہاں پر کثرت کے ساتھ کھیتی باڑی ہونے لگی۔ ان کاچھے کی زمینوں پر اس نے اس طرح محصول رکھا کہ پیداوار کے ۹ حصے رعایا اور ایک حصہ سرکار کو ملتا تھا۔ تب بھی سرکار یعنی ارغونوں اور ترخانوں کے ستر سل اور دبلی کے مغل تسلط کے بیس سل کے عرصے بعد ۱۹۰۷ء میں جہانگیر کی تخت نشینی پر خود یوسف میرک کے والد میر قاسم نمکین کو ملی، میر قاسم نے

اپنے بیٹے یوسف میرک کو ایک مفبوط ترین مسلح جماعت ساتھ دے کر یہون روانہ کیا اور خود ایک دو دن کے بعد پچھے پچھے قیام کرتا ہوا آ رہا تھا۔ اپنے یہون صوبے کے اس پسلے سفر کی رواداں بیان کرتے ہوئے یوسف میرک لکھتا ہے کہ ”راتے بھر جمل بھی میں نے نظر دوڑائی دیرانی ہی دیرانی نظر آئی۔ یوں لگتا تھا پنج کے دور میں وحشیوں نے بسرا کر رکھا تھا۔“ اس نے مزید ۲۰ سال گزرنے کے بعد ۱۹۲۸ء میں احمد بیگ کی نوابی اور اس کے ظالم بھائی مرزا یوسف کی کارستائیوں کا ذکر کر تیماہ سے خود پاہی لکھتا ہے کہ ”ملک کی حالت برپادی کے اس دہانے پر جا پہنچی تھی کہ چار پانچ ماہ سے خود سپاہیوں کو کوئی خرچہ نہیں مل رہا تھا۔ اس لئے کئی مرتبہ انہوں نے لوٹ مار چانے کی غرض سے پنوہر قوم پر حملہ کیا مگر ناکام ہوئے۔ بلا خروہ فصل جو قدرتی آفات کا نشانہ بن چکی تھی اس پر جا کر قبضہ کیا جیسے کوئی مفت چیز ہاتھ گلی ہو..... ادھر احمد بیگ کو خود ہاتھ پاؤں مارنے سے کچھ ہاتھ لگ جاتا تو وہ اس کے پاس پہنچنے سے پسلے کچھ اس کے لفٹنگ ملازم ہتھیا لیتے اور باقی پر باغی قبضہ کر لیتے۔“ چھ سال بعد اپنی کتاب کا انتظام کرتے ہوئے یوسف میرک لکھتا ہے ”احمد بیگ کے دور نوابی میں جو بستیاں دیران ہوئیں وہ اب تک دیران ہی رہیں۔“ خانوادہ سمه کی وطن دوست طرز حکومت کا والہانہ ذکر کرتے ہوئے یوسف میرک لکھتا ہے کہ ”واتھی اگر کوئی رعایا خوشحال ہو اور ان کے اوپر کوئی ظالم حاکم مسلط نہ ہو تو ایک ایک آدمی جو دس بیگھا بمشکل آباد کر سکتا ہے وہی پانچ سو سے لے کر ہزار بیگھا تک بلکہ اس سے بھی زیادہ زمین سر بنزو شاداب کر لے گے پیداوار بڑھائے گا اور خوشی خوشی محصول دے گا۔ اگر رعایا خوشحال ہے تو یقین ہے کہ وہ اپنی بساط کے مطابق دریا میں سے ایک چھوٹا سا ہالہ نکل کی اس سے دور دراز کی رتیلی بخرازیں آباد کر سکتے ہیں۔ جمل پر کسی شخص، چند پرند، تک سلیہ نہیں پڑا ہو..... میں نے خود ایسا ہی ایک مشاہدہ چاند کا کے علاقے میں کیا ہے جمل میرا بڑو ہم ایک زمیندار نے چھوٹے دریا جیسا ایک ہالہ نکل کر دور دور تک پھیلی ہوئی غیر آباد اور

برسون سے پڑی نہر زمین کو آباد کیا اور جمل کسی چند، پرند، انسن کی محل تک نہ دیکھی تھی وہی نئی بستیاں بنائیں، اس طرح اس نے "جوگی" اور "مشہ" ہی شربتائے، اس طرح نندہ ابتو نامی زمیندار "پوپٹی" ہی اور شاہ علی جو ابتوں کا پیر تھا اور خود کو مددوی کھلاتا تھا اس نے بھی "کوتل" ہی شربتائے۔ اس طرح ابتوں، سانگیوں اور سپخوں میں سے ہر شخص نے جو اس خطے کا رہنے والا تھا اپنے طور پر بند باندھ کر، ندی نالے بنا کر غیر آباد زمین کو آباد کیا اور چھوٹے چھوٹے میلے اور مگاؤں آباد کئے حتیٰ کی "بکھر" ملک کی جمعیتی ایک دم ۲۳ لاکھ "تکوں" سے بڑھ کر ۳۰ لاکھ سے ۳۰ لاکھ جا پہنچی اور یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ لوگوں کو کچھ عرصے تک ایک انسانی دل رکھنے والے نواب (محمد علی بیگ بندوی) کے زیر حکومت رہنے کا موقع میسر آیا۔"

تقریباً دو سال (۱۵۲۰ء۔۔۔۱۷۳۶ء) سنده اور اہل سنده ارغونون، ترخانوں اور دہلی کے مغل حکومت کے لامپی اور خون چونے والاوں کے زیرِ تسلط پتے رہے اور یوں ان کے یہ دشمن ان کی تہذیبی زندگی کا مگلا گھونٹتے اور جسمانی صلاحیتوں کو ختم کرتے رہے، ان کے ہر قومی اطمینان پر دشمن کی غور آور تنگینیں اٹھ جاتی تھیں..... مگر ان دو عصدیوں کا تمام وقت وہ اپنے بچاؤ اور وطن کی نجات کے لیے مسلسل لڑتے رہے۔ ان دو سالوں کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ اس سارے عرصے میں کوئی بھی ممینہ، ہفتہ یا دن ایسا نہیں گزرا جس میں وہ اپے مقدس فرض سے ایک لمحے کو بھی غافل ہوئے ہوں۔ مگر قابل افسوس بدقتی ان کی یہ بھی رہی کہ وہ اس پورے عرصے میں اپنے داخلی، قومی اور مذہبی نفاق کا شکار رہے اور اس نفاق کو بڑھانے اور اس سے فائدہ حاصل کرنے میں ان کے دشمن نے بھی کوئی سرا اٹھانہ رکھی، جنہوں نے اس مقصد کے لئے پہلی بات یہ کی کہ سنده کو نکڑوں میں تقسیم کیا اور ان کی متحد قومی ریاست کا شیرازہ بکھیر دیا۔ ارغونوں نے ”ولایت سنده“ کو چھ ”سرکاروں“ میں اور مغلوں نے چار ”ملکوں“ میں تقسیم کیا اور پورا عرصہ یہ یا وہ ”سرکار“ اس سے یا دوسرے ”ملک“ ”یا سرکار“ آپس میں لڑتے رہتے اور دوسرے یہ کہ تمام ”سرکار“ اور ”ملک“ اپنے وجود کی برقراری کے لئے اور لوٹ مار کو جاری رکھنے کے لیئے اپنے دائرے میں، ہر قبیلے کے

اندرونی تباہات بڑھاتے رہے اور ان کو ایک دوسرے سے نکرانے پر اکساتے رہے۔ لاکھا قبیلہ سیمیوں کے خلاف، سیمیوں کو سومروں کے خلاف، سومروں کو ماہیوں کے خلاف، ماہیوں کو مروں کے خلاف، مروں کو کمریوں کے خلاف، کمریوں کو کلموڑوں کے خلاف، کلموڑوں کو داؤ پوٹھ کے خلاف، داؤ پوٹھ کو پنڈھروں کے خلاف، پنڈھروں کو اس کے خلاف، بلوجیوں کو سماںوں کے خلاف، سماںوں کو بلوجیوں کے خلاف، جان بوجھ کر ورغلانے، لڑاتے، کمزور کرتے اور خون خرابا کرتے رہے۔ اس کے علاوہ مذہبی فرقہ دارانہ انتہا پسندی، مذاہب کے درمیان عدم مساوات اور عداوتوں ان کے لئے اپنے حکومتی کاروبار کو چلانے اور قابض اقتدار کو قائم رکھنے کا ایک تیرسا سوچا سمجھا اور آزمودہ طریقہ کار تھا جس کے ذریعے وہ محکوم قوم، اور عقائد و ایمان کی جال میں کچنسی ہوئی سادہ لوح رعایا کو آپس میں لڑاتے، خاموش کراتے اور اپنی ہمنوائی کے لئے بوقت ضرورت کام میں لاتے رہتے تھے۔

سندھ اور سندھی سماج کے پس دو سو سال غلامی کے آخری ۲۷ سال شاہ عبدالطیف بٹھائی نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھئے۔ وہ ۱۶۸۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۷۳۷ء میں مغلوں کے آخری نواب صادق علی خان، جس نے ملک بخشہ دہلی کے مغل شہنشاہ محمد شاہ رنجیلے سے بھیکے پر لیا تھا، اور اس نے پہلے سل کی بھیکے کی رقم جیسے تیسے پوری کر دی، دوسرے سل اسے نقصان ہوا اور اس نے ملک کی بگ ڈوڑ کلموڑوں کے سربراہ میاں نور محمد کے حوالے کر دی۔ ملک یہوں، ملک بھکر، ملک سیوی پہلے ہی اس کے ہاتھ میں آچکے تھے "اور اس وقت سے ہندوستان کے حکمرانوں کی حکمرانی کا سلسلہ بخشہ سے ختم ہو چلا اور عباسی خاندان "کلموڑا" کو بکھر، سیستان اور بخشہ کی فرمانروائی میں ہمیشہ کے لئے سرخ روئی نصیب ہوئی"۔ (تحفہ الکرام) اور یوں "سندھ کے ٹوٹے ہوئے نکڑوں کو جوڑنے کا مقصد بھکیل کو پہنچا۔ صدیوں بعد یہ پہلا مرحلہ آیا کہ متعدد سندھ کے انتظام اور ضابطے کی مرکزیت کے مقاصد ان اصلی اہل وطن حاکموں

کے ذریعے پورے ہوئے" (تاریخ کلموڑا مر)

کلموڑا سندھ کا قدیم اور اصل پاشندوں میں سے ایک نمایاں قبیلہ تھا جو ہمیشہ سے ہی سندھ کے باہر سے آئے ہوئے حکمرانوں کے خلاف اپنے طور پر مزاحمت کرتا چلا آ رہا تھا۔ تاریخ میں ان کی اصل نسل سندھی (چن) سے بتائی جاتی ہے حالانکہ سندھ اقتدار پر بیٹھتے ہی انہوں نے اپنی ذات عربوں سے جوڑنے کے لئے خود کو عباسی کملانا شروع کر دیا۔ ورنہ تب تک اور جیسا کہ آج بھی سندھ میں ان کی ذات کی شاخیں کلموڑا، داؤ پوٹھ، آربانی، یہسانی، وغیرہ مشور تھیں اپنے اپنے قبیلے کے نام کو چھوڑ کر خود کو عرب عباسی کملانا غیروں کے سلسلے میں ان سے احساس کتری سے زیادہ ان سے کاندھے جوڑنے اور خود اپنے لوگوں پر اپنی حاکمانہ برتری جتنا اور رعب بٹھانے کی کوشش کے متراff تھا۔ بہر کیف ان کے پسلے بڑے جام چن (۱۲۲۰ء) کا تاریخ میں ذکر ایک معتبر قبیلے کے معزز شخص کی حیثیت سے کیا گیا ہے، اسے یہون سے چھ کوس (۱۲) میل، دور جھانگ رابا جادا کے شربائے، وہ سات قبیلوں کا رجہ، ست چن، سہ، مر بلال، اور ڈھر کا سردار تھا۔ تاریخ سندھ میں یہ پہلی مثل ملتی ہے جب مختلف اور ایک سے زائد قبیلے مل کر وسیع تر قومی اتحاد کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ ایک بہت بڑا خبر گیری کرنے والا اور سلجھا ہوا نہیں دار اور صاحب حیثیت، سخن اور بہادر آدمی تھا۔ اس کا مستور تھا کہ وہ کسانوں کے پاس اناج کے بٹوارے کے لئے اپنے آدمی کبھی نہیں بھیجتا تھا۔ کسان اپنے طور پر پیداوار کا مقرر آٹھواں یا دسوال حصہ خود لا کر اسے دے جاتے تھے۔ جب وہ زمیندار کا حصہ لے کر آتے تو ان سے تین سوال کئے جاتے: تم پر کوئی قرض تو نہیں، تمہاری کوئی جوان بیٹی تو نہیں جس کی تمہیں شادی کرنی ہو، تمہارے گھر میں چھ مینے کی خوراک کا اناج ہے؟ اگر جواب ملتا کہ قرض دار ہوں، گھر میں بن بیاہی بیٹی ہے یا چھ ماہ کا اناج گھر میں نہیں تو اس سے بٹائی کا حصہ نہیں لیا جاتا اور تاکید کی جاتی کہ جا کر اپنی ضروریات پوری کرو۔ سندھ کا معزز سردار

جام پنہ سندھ کے وطن دوست سومو حکمرانوں کے دور سے تعلق رکھتا تھا۔ سندھ کے اصل باشندوں پر مشتمل حکمرانوں کی ریاست کے زیر سلیہ سندھی تہذیب اور اس کی تعمیر و ترقی کے دور کے کئی اور واقعات اور سندھی سورماڑیں کے داستان ملتے ہیں۔ جس میں ان کی بہادری، عدل و انصاف، غیرت، نیکی اور سخاوت کی مثالیں بیان کی گئی ہیں۔

جام پنہ کی دسویں پشت میں جب سندھ کی اصل حکمرانی کے سنگی دور کو خیم ہوئے بھی ایک سو سال گذر چکے تھے اور اس درمیان ظالم اور لیبرے ارغون اور ترخان جیسے باہر سے آئے ہوئے حکمرانوں کا دور بھی آخری سانس لے رہا تھا اور ان کی مجھے دہلی کے اور زیادہ ظالم اور خون چوٹے والے مغل تسلط کی صدی شروع ہونے والی تھی، تب کلموڑا قبیلے کا ایک دوسرا ایسا ہی نیک نام، بہادر، وطن پرست، قبیلوں کا سردار، میاں آدم شاہ کلموڑا سندھ کی تاریخ میں نمودار ہوا۔ ۱۵۹۶ء میں شہنشاہ اکبر کی طرف سے عبدالرحیم خان خاہی سندھ کو ترخانوں سے چھین کر مغل تسلط میں لانے کے لئے مقرر ہوا۔ اپنے کام کی کامیابی کے لئے سندھ کے جن بزرگوں کے پاس وہ گیا ان میں میاں آدم شاہ کلموڑا بھی شامل تھا۔ میاں آدم شاہ نے ترخانوں اور مغلوں کے تصادم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بیرونی فاتحوں کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا اور ایک تاریخ نویس کے الفاظ ہیں۔ ”کیونکروہ امن میں خلل ڈالنے پر بضدھی تھے اس لئے ملک میں شہید ہوا۔“ ایک اور مورخ کے لفظوں میں ”میاں صاحب کے خلاف ملک کے حاکم کے دل میں حد پیدا ہوئی اور جس نے ان پر حملہ کروا دیا۔ میاں صاحب کے ساتھی ہار گئے اور وہ پکڑے گئے اور انہیں سزاۓ موت دی گئی۔“ سندھی کے ایک اور مورخ نے اس واقع کو یوں بیان کیا ہے۔ ”میاں آدم شاہ کے مریدوں کا حلقة اتنا وسیع ہو گیا تھا کہ اس کی وجہ سے نزدیکی زمیندار اور پڑوی قبیلے کے سرداروں کے دل میں حد پیدا ہوئی۔“ جنہوں نے بعد میں میاں صاحب کے خلاف بھکر کے (مغل) ہائم کو خونتاک باتیں بتائیں۔ ہائم نے میاں صاحب کو ملک بھیج دیا۔ جہاں انہوں نے جام

شہادت نوش کیا۔" سترہویں صدی کے ایک فارسی شاعر نے اس موقع کو یوں بیان کیا ہے۔

"بتر سید والی ز پیر و مرد، بایہمی حاکم ہلاکت و سید"

جس میں "ولی" سے مراد بکھر کے ناظم سے ہے جو "پیر اور اس کے مردوں سے خوفزادہ ہو گیا تھا" اور "حاکم" سے مراد ملتکن کا حاکم ہے جس نے ان کو شہید کروایا۔ میاں صاحب اس طرح دشمن وطن سے لڑتے ہوئے، وطن پر قربان ہو گئے۔

میاں صاحب شہید کی اس قربانی سے تقریباً ایک سو سال بعد ۱۲۸۹ء میں حضرت شاہ عبدالطیف بھٹائی نے جنم لیا۔ اس درمیانی عرصہ میں میاں صاحب کے پوتا، میں شاھل محمد، مغل حکمرانوں سے وطن کی آزادی کی جنگ لڑتے ہوئے مارا گیا۔ اس کے بعد اس کا بھیجا، میاں نصیر محمد (وفات ۱۲۹۲ء) کو اسی وطن دوستی کے جرم میں عمر کے کئی برس لابھو، ملتکن، میں جلا وطنی کے عالم میں گزارنے پڑے، اور گوالیار اور دہلی میں اور نگزیب کی قید میں بھی رہتا پڑا۔ میاں نصیر محمد کے بیٹے میاں دین محمد نے دشمن کے خلاف اپنی جنگ جاری رکھی، اور اور نگزیب کے بیٹے معزال الدین اور ان کے نوابوں اور پہ سالاروں کو کئی مقامات پر نکلت سے ہم کنار ہونا پڑا لیکن آخر کار وہ دشمن کے دام فریب میں آگیا اور قرآن پاک کی ضمانت پر اپنے دو قریبی عزیزوں سمیت مذاکرات کے لئے معزال الدین کے پاس گیا جس نے وعدہ نکلنی کی اور انہیں گرفتار کر لیا اور ملتکن لے جا کر اسے اور اس کے دونوں ساتھیوں کو بے رحمی سے ازیتیں دیں اور جسم نکڑے نکڑے الگ کر کے ہلاک کروادیا۔ میاں دین محمد اور ان کے ساتھیوں کی شہادت کا یہ واقعہ ۱۷۰۰ء عیسوی میں پیش آیا۔ اس وقت شاہ عبدالطیف گیارہ سال کے تھے۔ میاں دین محمد کے بعد اس کے چھوٹے بھائی میاں یار محمد بمعہ اہل و عیال اور دوسرے ساتھیوں سمیت پہاڑی علاقوں میں پناہ گزیں ہو گیا اور وہاں سے مغل شہزادے معزال الدین کی فوج سے جنگ جاری رکھی اور اسے نکلت دی۔ بعد میں پہاڑوں سے

نیچے اتر آئے اور نیگ (ضلع دادو) سے ہوتا ہوا منچھر جھیل کے کنارے والے شہروں، سامتانی اور گاہن کے اراضی، فتح پور (؟) شکار پور (خدا آباد) گھیرو، کھاری، کندھیارو، لاڑکانہ آزاد کرا کے اپنے قبیٹے میں لے لیے۔ بہت جلد جب مغلوں نے اپنی حکومت کے سورج کو روپہ زوال دیکھا تو پہلے پہل سیوی اور ڈاؤھر کا انتظام بطور رشوت اور بعد میں بحالت مجبوری پورے بکھر اور پورے یہوں کے علاقے کا اختیار میاں یار محمد کے حوالے کیا اور اسے خدا یار خان کے لقب کے ساتھ خلعت، سونے کی سکنگی، تکوار، گھوڑا، اور ہاتھی بھی حوصلہ افزائی کی خاطر دیئے۔ سر زمین سندھ کے ایک حصے شمالی سندھ کے اقتدار کی یہ منتقلی ۱۷۰۸ء سے ۱۷۱۴ء تک عمل میں آئی۔

اپنے وطن عزز کی ناموس اور نجات کی بحالی کی جدوجہد کے یہ ڈرامائی واقعات شاہ عبداللطیف نے اپنی انگھوں سے دیکھے اور کانوں سے نے، جب یہ واقعات رومنا ہوئے وہ بھرپور جوان تھے، اس وقت ان کی عمر ۱۹ سے ۲۲ سال تھی۔ ملتان کے محل حاکم، اور گنگ زیب کے بیٹے معزال الدین، کے فریب کی وجہ سے گرفتار ہو کر سندھ پر قربان ہوئے والے میاں دین محمد اور اس کے دو ساتھیوں کی شہادت کے دنوں میں شاہ صاحب ॥ برس کے تھے۔ اس کے بعد باقی گیارہ برس سندھ اور سندھ کے لوگوں کی نجات اور تحفظ کی اس تحریک کا مشاہدہ جس کے عمل کا دائرہ شمالی سندھ میں تھا اور جس متحرک اور توانائی کا مرکز اور روح کلموڑا قبیلے کے بزرگ تھے، براہ راست اور قریب سے قریب رہ کر کرتے رہے۔ اس قدر جذبے سے سرشار اور جاندار قومی جدوجہد کے دوران پورے سندھ میں کلموڑا خاندان کے وطن دوست بزرگوں کے کارناموں کی داستان سب سے پہلے ان کے نیک مرد، جام چند سے لے کر مظلوم شہید میاں آدم شاہ، میاں شاھل محمد، میاں نصیر محمد، کا طویل ترین قید و سند، میاں دین محمد اور اس کے ساتھیوں کی شہادت اور میاں یار محمد کی کامیاب جنگی کارروائیوں تک ہر عورت، مرد، بچوں جوانوں اور بوڑھوں، میں کمبل عام ہوئی ہو گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنے قومی

راج سرداروں اور حاکموں، سومروں اور سموں کے عظیم و ملٹی ریاست کے دنوں کے قصے اور داستانیں بھی ہر ایک زبان پر عام ہوئیں ہوں گی۔ درمیان میں ارغونوں، ترخانوں اور دہلی کے مغل حکمرانوں اور ان کے وحشی اور سفاک نوابوں کی خونخواری کی دو سو سال دور حکومت کی دل ہلا دینے والی کارستاتیوں کی داستانیں بھی لوگوں میں عام ہوئیں ہو گئیں۔ سندھ کی تاریخ کا یہ ایک بحرانی دور تھا اور پورا سندھی سماج اس منزل پر آیے۔ بحران کی انتہائی تیزی اور شدت کی کیفیت سے دو چار تھا۔ جب سندھی سماج کی قسمت کا سوال اٹھا تھا اور اس کے حل کی راہ ہموار ہونے شروع ہوئی تھی، اور ان کے ذہنوں میں اپنے وجود کا خیال کے اپنی اہمیت کے شعور کا احساس ایسے بیدار ہو رہا تھا جیسے موسم گرامیں کالے کالے بادل ٹھیل سے گھر گھر کر آتے ہیں اور دیکھتے دیکھتے پورے آکاس پر چھا جاتے ہیں۔ شاہ کے اشعار ہمارے پاس اس ابھرتے ہوئے قومی شعور کے احساس اور اس کے اطمینان اور اس سماجی وجود کی اہمیت اور قسمت کے بنیادی سوال کے حل کے نشان ہیں۔ شاہ کے حاسِ ذہن میں سندھ اور سندھی سماج کی غلامی کے جنم کے خلاف کسی پر بمار اور روح پرور مرست کی بہشت کا خواب جلوہ گر ہوا تھا۔ سندھ کی ریاست سندھ کے مذہب اور سندھ کی تہذیب کو اپنا کہنا اور اس میں اپنا بیت کو دیکھنے کا خواب شاہ کی پوری شاعری اس خواب کا عکس اور بیان ہے، کیونکہ یہی بات، یہی امنگ اور یہی مقصود شاہد شاہ کے دور میں سندھ اور سندھی سماج کی اصلی، حقیقی اور اہم بات تھی۔

۷۰۰ءے مغلوں کے شہنشاہ اور نگزیر کا انتقال ہوا۔ اور اس کی موت کی ساتھ اس کی عالمگیریت بھی ہوا ہو گئی۔ اس وقت شاہ عبدالطیف کی عمر ۱۸ سال تھی۔ مغلوں کی ”سندھ ولایت سوان“ کے تین ملک، سیوی، ملک، بکھر، ملک سوان پہلے ہی یا ان کے کچھ سالوں بعد ۷۱۰ءے تک مغل تسلط سے عملی طور پر آزاد ہو چکے تھے باقی صرف ٹھنڈھ رہ گیا تھا جو اس فانچ زدہ مغل تسلط کے زیرِ انتظام تھا۔ سندھ کی نجات اور بحالی کی

تحریک کا دوسرا دائرہ جنوبی سندھ (لار) میں تھا جس کا روشنی مرکز اور روح روائی بمحورہ علاقے کی جھوک (نصریہ، میران پور) کے لانگاہ قبیلے کے بزرگ تھے۔ اس درویش خاندان کے پسلے بزرگ کا ذکر جو میاں آدم شاہ کلموڑ کے ہم عصر تھے، سندھ کی تاریک مخدوم صدر لانگاہ کے نام سے ملتا ہے۔ جس کے لئے کہا جاتا ہے کہ وہ ایسا آگرال دینا تھا کہ رات کو پانی کے بھرے ہوئے منکے بھارتی تھا۔ اور کہتا ”نیا دن نیا رزق“ اس کے عقیدت مندوں کو وسیع حلقے میں مختلف قبیلوں کے ساتھ ساتھ جنوبی سندھ کے میاری و سادات شامل تھے۔ مخدوم صدر لانگاہ کی پانچویں پشت سے سندھ کے شاہ شہید عنایت نے بالکل ایسے ہی حالات میں اور اسی طریقے سے شخص کے مغل نواب کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا، جن حالات میں اور جس طرح کلموڑوں کے سرفروش بزرگ، میاں آدم شاہ متن کے مغل نواب کے ہاتھوں تقریباً ایک صدی پسلے شہید ہوئے تھے۔ ان حالات میں فرق تھا! کہ میاں صاحب شہید کی پانچویں پشت میاں یار محمد کلموڑ جس نے مغلوں سے ”بکھر“، ”سیون“ اور ”سیوی“ آزاد کرائے وہی میاں یار محمد اپنے اس مظلوم پردادا شہید کی شہادت کو بھلا کی خود اپنے عظیم مقصد یعنی سندھ کے عظیم تر اتحاد اور قومی ریاست کے قیام کو بھلا کی خود سندھ کے معصوم شہید شاہ عنایت کی شہادت میں ان خونخوار اور خونی مغل دشمنوں کا حامی ہو گیا۔ یہ کیونکر ہوا؟ اس کا سیدھا سا جواب ہے: قومی اتحاد کے اصولوں کی ناکامی۔ قومی اتحاد کے کیا اصول ہیں اور ان کی ناکامی کیا ہے ان کا ذکر آگے چل کر کریں گے۔ مگر سندھ کی تاریخ کے اس اہم بھرپور دور میں جب سندھی قوم کی قوت کا سوال اٹھایا گیا تھا اور اس کے حل کے لئے زمین ہموار ہو رہی تھی۔ اس کی نجات اور بحالی کے لئے لڑنے والا) کے نفاق کے نت میں سے ایک فرق پسلے ہی دائرے میں کامیابی حاصل کر چکا تھا) کے نفاق کے نتیجے میں سندھ اور سندھ کے لوگوں نے کیا برداشت کیا اور ان کی تاریخ تاریکیوں کی کیسی درد ناک کھائیں تک جا پہنچی، اس کا صحیح اندازہ تک لگانا مشکل ہے۔ اور نگزیب کے انتقال

کے بعد (۱۷۰۷ء) اس کے بیٹوں اور پوتوں کے درمیان فلو اور لڑائیوں (چھ سال میں چار شزادے تخت نشین ہو کر دستبردار ہو گئے) مغل اقتدار کا زوال (جس کے لئے کہاوت مشور ہوئی کہ "شاہ عالم ازدیل تاپالم" یعنی شاہ عالم، ۱۷۱۲ء کا حکم فقط دہلی سے پالم تک مغل نظام کی پستی (جس کا ذکر مشور مزاہ گو شاعر جعفر زمی نے اس طرح کیا ہے کہ "مکہ زد بر گندم موٹھ مژرا دشادھ پ سکش فرخ سیر" یعنی فرخ سیر، پھر مارنے والا بادشاہ گندم موٹھ اور مژرا پر محصول لگا رہا ہے)، خود ٹھنڈھے میں ملک نوابوں کی ایک کے بعد ایک کی مقرری اور معزولی - ۱۷۰۷ء سے ۱۷۱۸ء تک آٹھ نواب آئے اور گئے) اور ان کی محلاتی سازشیں اور خانہ جنگیاں، سارے ملک میں تحفظ اور بد امنی، اور اس کے ساتھ سارے سندھ (سیوی، بکھر، اور سیون کے علاقے) کا مغل تسلط سے پہلے ہی نکل جانا، ایسے حالات میں باقی سندھ کو مغلوں کے شکنخ سے چھڑانا، کتنا ہی آسان معاونہ ہو سکتا تھا! مگر ایسا ہونہ سکا۔ سندھ میں مغل تسلط کی گرتی ہوئی عمارت گرتے گرتے سندھ کی آزادی کے لئے کوششیں دو مرکزوں کو آپس میں نکرا کر ہی رہی اور اپنا اپ بچا کر پورے کے پورے ۲۰ سال اس کے بعد بھی وہ دیے کی ویسی سندھ کے لوگوں کے سینوں پر مسلط رہی۔

جوہک (شاہ عنایت کی شہادت) کے قومی سانحے کے وقت (۱۷۱۸ء) شاہ کی عمر ۲۸ برس تھی۔ جب ۲۰ برس بعد ۱۷۳۷ء میں مغلوں نے دلایت سندھ کے باقی حصے ٹھنڈھ کو بھی کلموڑوں کے میاں نور محمد کے حوالے کیا اور سندھ سے اپنا بوریا بستر باندھا، تب وہ اپنے زوال کے ایسے کھڈ میں گر چکے تھے کہ "شامت اعمال ما صورت نادر گرفت" روح قبض کرنے والا عذاب ان پر نازل ہو چکا تھا۔ کلموڑے اگر ۲۰ سال پہلے یہ سیاسی غلطی نہ کرتے اور ٹھنڈھ کی نوابی کے لئے مغلوں پر نہیں بلکہ شمال سندھ کی طرح ملک ٹھنڈھ جنوبی سندھ کی نجات کے لئے اپنے جیسے ہی درویش مجاہد صوفی شاہ عنایت شہید اور ان کے فقیروں پر بھروسہ کرتے تو سندھ کے اتحاد اور آزادی سے

متعلق یہ خواب ۲۰ سال پہلے ہی عمل میں آ چلا ہوتا، اور ان ۲۰ برسوں میں انہیں اپنے وطن کو خوشحال اور مضبوط کرنے کا نادر موقع مل جاتا اور ایسے میں نہ تو نکست خورده محمد شاہ رنگیلے کو سندھ کے نادر شاہ کے حوالے کرنے کا سبب ملتا، اور نہ خود نادر شاہ کو پلٹ کر سندھ پر حملہ کرنے کا آسان بہانا ملتا، نہ ہی ہمت اور حوصلہ ہوتا۔ کلموڑوں کی اسی سیاسی غلطی کی وجہ سے جس کے سبب ایک طرف سندھ کے لوگوں میں تفرقہ برقرار رہا اور دوسری طرف ان کو اپنی متحہ قومی ریاست کو مضبوط کرنے کی فرستہ مل سکی، جب دو برس بعد ۷۳۹ء میں نادر شاہ دہلی کی آسان ترین فتح کے سعید میں وہاں کی بے انداز دولت اور مل غنیمت کے ساتھ سندھ کو بھی اس کا حصہ سمجھ کر سندھ پر حملہ آور ہوا، تب کلموڑوں کی حکومت سندھ کا دفاع نہ کر سکی اور سندھ ایک بار پھر سے نکڑے نکڑے ہو گیا۔ ورنہ تاریخ شاہد ہے کہ یہی نادر شاہ تھا اور یہی اس کی فوج تھی جب ایک سال پہلے کا سوچ رہا تھا مگر اس راستے سیوی اور گنجاب کے حاکم میاں نور محمد کو مقابلے کے لئے تیار کھڑا دیکھ کر اس نے درہ بولان کا راستہ تبدیل کر کے غزنی، کابل اور درہ خیر کا راستہ اختیار کیا۔ حقیقت میں سندھ پر نادر کے اس تباہ کن حملے اور اس میں کامیابی کے لئے بھی سندھی سماج کا اپنا داخلی نفاق جوابدار تھا۔ ۷۳۹ء کے اوآخر میں سندھ پر حملہ کرنے کے لئے جب نادر اپنی فوجوں کو لے کر ڈیرہ اسماعیل خان تک پہنچا تو داؤد پونہ (کلموڑا خاندان ہی کے ایک شاخ) کی رئیس امیر صادق محمد خان خود اس کے پاس گئے اور میاں نور محمد کلموڑو کے خلاف نادر کو ہر قسم کی مدد کی پیش کش کی اور سارا راستہ اس کے ساتھ رہا۔ "تاریخ سندھ۔ کلموڑا دور" کا مصنف مولانا "مر" ۷۳۷ء میں مغلوں کے ہاتھوں تختہ کامیاب نور محمد کے حوالے ہوتا اور یوں اس کے ماتحت سندھ کا متحہ ہوتا اور ان کی ایک مرکزی متحہ ریاست کے قیام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "صدیوں کے بعد یہ موقع میر آیا تھا کہ متحہ سندھ کی

ریاست کا انتظام اس کے اصل باشندوں کے ہاتھوں میں تھا اور وہ اہل سندھ کی ضرورتوں سے پوری طرح آگہ تھی اور خلوص قلب کے ساتھ اس کو پورا کرنا وہ اپنا اولین فرض سمجھتے تھے۔ یہی نادر موقع تھا کہ سندھی اپنے قومی حکمرانوں کی خدمتوں سے پوری طرح ملا مل ہوتے اور صدیوں سے وہ جن مصیبتوں اور معوبتوں کا شکار تھے ان سے نجات پالیتے۔ کہ اچانک ایک وحشت تک آفت سندھ کی افق پر نمودار ہوئی جس نے اس سرزمین کی نئی زندگی کی امید کو ایک بار پھر خاک میں ملا دیا اور یہ اچانک آفت پر نادر شاہ ایرانی کی صورت میں نازل ہوئی..... میاں یار محمد اور میاں نور محمد نے قریب قریب چالیس برس کی جانشانی کے بعد جا کے سندھ کے الگ الگ نکلوں کو ملا کر ایک کیا اور عوام کی فلاہی مملکت کا انتظام کیا تھا۔ لیکن نادر کے حملے نے ان چالیس برسوں کی محنت پر ایک دم سے پانی پھیر دیا۔ دونوں میاں صاحبوں نے اس سرزمین کے وسائل بستر بنائے۔ ان کا اصل مقصد خزانہ جمع کرنا نہیں بلکہ یہ تھا کہ عوام کے لئے امن اور خوشحالی کے زیادہ سے زیادہ وسائل پیدا کیے جائیں، لیکن چالیس برسوں میں جو کچھ اکٹھا ہوا تھا وہ نادر ایک ہی مرتبہ لوٹ کر لے گیا..... بہر حال اس سے بڑھ کر سندھ کے نقصان کا باعث جو بات تھی وہ یہ کہ سندھ کی وحدت پھر سے پارہ پارہ ہو گئی۔ ”ایک اس حصہ (کچھی ڈھاڑھر اور کراچی) فلات کے حصے میں آگیا، شکار پور اور اس کے آس پاس کا علاقہ داؤپٹوں نے لیا اور ملک کا باقی حصہ (نہنہ کا علاقہ وغیرہ) میاں نور محمد کے پاس رہا۔ میاں صاحب کا بڑا بیٹا محمد مراد یاب دو ہزار سواروں اور دو بھائیوں غلام شاہ اور عطر خان سمیت نادر کے پاس ۷۳۷ء میں اس کے قتل ہونے تک ایران میں یہ غلال رہے۔ اس کے علاوہ ”سندھ کا تب خانہ اور جرائد بھی وہ سفاک، نیپاک اپنے ساتھ لے گیا۔“ مطلب یہ کہ سندھ اور اہل سندھ اپنی تاریخ کی عین اس منزل پر جبکہ ان کے سامنے قومی بحیثیتی کا سوال ہی ایک اہم اور واحد سوال تھا، وہ اقتدار کے سلسلے میں ایک دوسرے پر بیک کا شکار ہو گئے اور اندر وہی نفاق اور

رنجھ کے باعث ایک دوسرے کے لئے بجائے طاقت کے کمزوری کا سبب بن گئے۔ اور یوں صدیوں بعد قومی اتحاد کی بحالی کا ملا ہوا موقع ہاتھوں سے گزنا بیٹھے اور اتنی جدو جمد اور قربانیوں کے بدالے جیتی ہوئی آزادی کی بازی ایک مرتبہ پھر بار کر بیٹھ گئے۔ نادر کے حلقے کے وقت شاہ صاحب کی عمر ۵۰ برس تھی اور چل گیارہ برس کے تھے، سامنے ۱۰ برس کے تھے۔ نادر کے قتل ہونے کے بعد سندھ کے تین شہزادوں میں سے، غلام شاہ اور عطر خان جب ۱۷۳۹ء میں ایران سے آزاد ہو کر اپنے وطن (سندھ) لوئے تو چل اور سامنے ۲۰ اور ۱۹ سالوں کے کڑیل جوان تھے۔ دو سال بعد سندھ کا ولی عہد شہزادہ محمد مراد یا بھی واپس اپنے وطن پہنچا۔ حضرت شاہ عبدالطیف بھائی کو اس کے بعد اس خاکی جسم میں فقط ایک سال رہتا تھا۔ ان کی عمر کے پورے ۶۳ سال ہی سندھ کی آزادی اور اتحاد کی جدو جمد کے سلسلہ تھے۔ گیارہ برس کی صغیر عمر میں انسوں نے اپنے شہزادوں کے پردادا میاں دین محمد اور ان کے دو ساتھیوں کو وطن کی آزادی کے لئے لڑنے کے جرم میں سندھ سے باہر ملتیں میں کٹ کر نکلے ہوتے سن۔ ۲۲ سال کی عمر میں انسوں نے اسی میاں دین محمد شہید کے بیٹے میاں یار محمد کی زیر کمان شامل سندھ کی سیون اور بکھر کو غیروں کے قبضے سے آزاد کرواتے دیکھا۔ ۲۸ برس کی عمر میں انسوں نے آزادی کے بعد مجاهد صوفی شاہ عنایت اور ان کے فقیروں کو جنوبی سندھ کی آزادی کے لئے پروانوں کی طرح لڑتے لڑتے قریب ہوتے دیکھا۔ اڑتالیس برس کی عمر میں انسوں نے سندھ کی آزاد وطنی ریاست کے دو سو سالہ پرانے خواب کی عملی تعبیر ہوتے دیکھی جب پورا سندھ اپنے جنوبی (لاڑ) اور شمالی علاقوں سمیت میاں یار محمد کلہوڑو کے زیر حکمرانی آیا، اور تاریخ میں ایک مرتبہ پھر دوبارہ اس کی ایک تحد اور آزاد ریاست وجود میں آئی، اور دو سال بعد اس نے خواب کو ٹوٹھے ہوئے بھی دیکھا۔ ”جب نادر شاہ شکار پور، لاڑکانہ اور نوشہرہ سے ہوتا ہوا شہزاد پور تک آن پہنچا تو اسے کچھ ایسے لوگ آکر ملے جو میاں صاحب کے مقابلہ تھے۔ انسوں نے اسے

عمر کوٹ کے راستے کا پتہ دیا (جہل میاں نور محمد فوج حکمت عملی سے کام لے کر محفوظ بیٹھے گئے تھے) اتنے میں ماچھی قبیلے کی فوج کا ایک دستہ نادری لشکر کے سامنے راستہ روک کر کھڑا ہو گیا اور بڑی بہادری سے لڑا۔ ابھی یہ جنگ جاری تھی کہ صحراء تھر کی طرف سے ایک اور فوج نمودار ہوئی جو میری قبیلے والوں کی تھی جس پر فقط نوسووار تھے۔ انہوں نے اتنی پھرتی اور تیزی سے حملہ کیا کہ ایرانیوں کے پیروں کی آنکھیں آکھڑتے رہ گئے۔ (سندھ کے لشکر کے) یہ جانباز دستے نادری سیالب کو بہرحال روک نہ سکے۔

شاہ صاحب اپنے بھٹ کے آستانے پر شداد پور سے چودہ میل دور بیٹھے قومی عظمت و ذلت کے سارے رنگ دیکھتے رہے اور باتیں سنتے رہے۔ جیسے ہی نادری غنیم داپس ہوا دیے ہی والی سندھ میاں نور محمد نے اپنی طاقت برعہائی اور مفبوط کرنا شروع کی۔ اس کے لئے انہوں نے ۱۷۳۸ء میں بمبئی کے انگریزوں سے انسیس (۲۹) توپیں اور دوسرے سال دس بڑی توپیں بھی درآمد کر لیں۔ مگر شاہ صاحب یا میاں نور محمد، دونوں میں سے کوئی بھی دوبارہ سندھ کا اتحاد و آزادی نہ دیکھ سکا۔ شاہ صاحب ۱۷۵۲ء میں انتقال کر گئے اور ان کے تین سال بعد میاں نور محمد اپنے نور چشموں اور امیدوں کے مرکزوں کو عمل و اخلاق کا وصیت نامہ دے کر اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ سندھ کی ان دو اعلیٰ ہستیوں کے انتقال کے بعد ۱۷۶۰ء میں دونوں کی دعاویں اور امیدوں کے مرکز، میاں غلام شاہ کلموڑو، کے ہاتھوں سندھ کے اتحاد و آزادی اور سندھ کی وطنی ریاست کے قیام کا مقصد ایک مرتبہ پھر پورا ہو سکا۔ اس کے بعد سندھ کی کلموڑی ریاست ایک بار پھر سے جانشینی کے تفریقے میں ایسی غلطیاں ہوئی کہ ۱۸۰۳ء تک کلموڑہ حکمران ایک دوسرے کے خون سے اپنے ہاتھ رنگتے رہے۔ ایک کے بعد دوسرا آتا اور جاتا رہا۔ حتیٰ کہ اس کی جگ تاپور آگئے، اور وہ بھی سندھی ریاست کو صرف چالیس برس برقرار رکھ سکے اور اسی طرح کے اپنے داخلی نفاق اور اقتدار کی سکنی کی تباہ کاریوں کا شکار ہو گئے۔ اور یوں سندھ اور سندھی سماج ایک مرتبہ پھر سات سمندر پار سے آئی ہوئی غیر قوم کا

غلام ہو گیا۔ شاہ صاحب کا روحانی وارث چل سرمت اس تاریخ سے کوئی سولہ سل
پیشہ انتقال کر چکا تھا اور سامی کا اس کے بھی بعد ۱۸۵۰ء میں انتقال ہوا۔

شاہ، چل اور سامی کے دور کے یہ برس (۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۹ء) سندھ اور سندھی
سامج کی تاریخ کے انتہائی اہم اور بنیادی طور پر بھرائی برس تھے۔ ان دنوں سندھی سماج
اپنے اجتماعی وجود کی بحالی اور بقاء کی جدوجہد میں معروف تھا۔ مگر افسوس کہ اس کا
جدوجہد کی کامیابی کی لازمی شرط یعنی قومی اتحاد، سندھی سماج کو نصیب نہ ہو سکا۔ اس کا
اصل سبب سندھی سماج میں اقتدار کے لئے داخلی سکھش اور گروہی تصادم تو تھا ہی مگر
اس کا اتنا ہی بڑا سبب مذہب بھی تھا۔ سندھی سماج کے ان دو داخلی امراض نے اس کو
جیسے پلے دیے اس دور میں بھی ریاست نہ بننے دیا اور نہ قوم۔

اکثریت کے مذہب کی کثیر تعبیروں نے نہ صرف یہ کہ اس اکثریت کی اعتقادی
یکسوئی کوتباہ کیا بلکہ اس میں وطن دشمنی اور قومی غداری کی حد تک فرقے پیدا کئے۔
اقلیت سے مذہبی رویے کا حال یہ تھا کہ "لا اکیرہ فی الدین" اور لكم دینکم
والدین جیسے عظیم مصالحتی اصوات کے ہوتے ہوئے بھی صرف "رسو" کہنے والے کو
"رسی" میں باندھ دینے کے لئے افراد تیار جیٹھے تھے۔ حکمران اکثریت مذہب والوں کے
پاس لفظ "بنیا" تب بھی خارت اور خواری کے طور پر ہندوؤں کے لیے استعمال ہوتا
تھا۔ شاہ کی زندگی کے دور کا یہ واقع (جیسے بیاض ہاشمی میں آیا ہے) کہ ۷۴۵ھ (بمطابق
۱۳۲۷ء) میں ایک ہندو بال چند نامی نے مسلمانوں سے باتیں کرتے ہوئے جواب میں
کہہ دیا کہ "میں بنیا نہیں ہوں۔" پھر تو اس کے لئے قیامت برپا ہوئی کہ "اس نے
ہندو ہونے سے انکار کیا ہے لہذا یہ مسلمان ہو گیا!" اس بیچارے نے بہت زیادہ آہ بکاہ
کی مگر سب بے سود، اس کے اوپر گواہ متقرر ہوئے اور مسئلہ قائمیں اور مفیسوں کے
سامنے پیش ہوا۔ شخصیت کے مخدوم ضیاء الدین، مخدوم حاجی محمد ہاشم، شیخ عطا اللہ مفتی،
شیخ عنایت اللہ مفتی، اور شیخ محمد عارف مفتی، نصر پور عزت اللہ مفتی اور مخدوم

عبدالحالق، نوشرہ کے مخدوم ابوالعلی، گھارو کے مخدوم عبدالرحیم، کوڑی کے مخدوم عاقل، اور کھاہی راہو کے مولوی محمد کامل نے ایک رائے ہو کر فتویٰ دیا کہ بل چند مانے یا نہ مانے لیکن وہ یہ الفاظ کرنے کے بعد مسلمان ہو گیا اور اس پر اسلام کے اركان واجب ہیں، انکار کی صورت میں اسے مرتد شمار کیا جائے گا جس کی سزا قتل ہے۔ ایک ایسا ہی واقعہ شاہ صاحب کے دور کا بھی ہے جو اسی بیاض میں ہے) کہ ۱۵۹ھ (بمطابق ۱۷۳۶ء) میں دو آدمیوں نے ٹھنڈے کے عالموں اور قانیوں کے سامنے ایک ہندو عورت کی بابت یہ شادت دی کہ اس نے احمد نامی ایک شخص سے زبانی لڑائی کرتے ہوئے اسے بے ایمان کیا، جس پر احمد نے اس سے پوچھا، کہ تو ایمان رکھتی ہے؟“ جواب میں عورت نے سندھی میں کہا ”ہاں میں ایمان رکھتی ہوں۔“ - اب سوال یہ اٹھا کہ وہ ہندو عورت یہ جملہ کرنے کے بعد مسلمان ہو چکی ہے یا نہیں؟ عالموں نے جواب دیا کہ وہ ہندو عورت یہ جملہ کرنے کے بعد مسلمان ہو چکی ہے، حاکموں پر لازم ہے کہ وہ شواہدات کی نشاندہی کے پیش نظر اس عورت پر اسلام کے احکام جاری کریں۔ مذہبی رسہ کشی اور دھنکار کے لئے یہ دو مثالیں کوئی ایسی خاص اہمیت کی حامل نہیں جبکہ ”بیاض ہاشمی“ یا کئی اور بیاضیں ایسے کئی مثالوں سے پر ہیں۔ اور یہ صور تھال صرف سندھ کی یا اس دور کی نہیں تھی بلکہ اس سے بھی ڈھانی سو سال پہلے سندھ کے سہ حاکم جام نظام الدین عرف جام ننده کے (دور حکومت ۱۵۶۰ء سے ۱۵۰۷ء) کے ہم عصر شمالی ہند کے حاکم سندر لودھی کے دور کے متعلق ”طبقات اکبری“ میں آیا ہے کہ ”ایک برصہن بود، بن نامی کانیہ شر کا رہنے والا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے مسلمانوں کے آگے اقرار کیا کہ اسلام سچا اور میرا نہ بھی صحیح ہے، (اسلام حق است و دین من نیز درست است) ان کی یہ گفتگو کسی طرح عالموں کے کانوں تک پہنچی جن میں لکھنؤتی کے رہنے والے دو مولوی قاضی پیارے اور شیخ بدھے نے خواہ مخواہ اس بات کو طول دی اور وہ سیدھے دبی کے نواب اعظم ہمیوں کے پاس گئے جس نے اس برصہن کو ان

مولیوں کے ساتھ (سلطان سندر لودھی) کی طرف (صدر مقام) سنبل روانہ کیا چونکہ سلطان کو علمی مذاکرات سے بڑی دلچسپی تھی اس لئے اس نے ہی گرامی علماء کو ہر طرف سے بلا بھیجا جن میں میاں قادر بن شیخ خو، میاں عبداللہ بن اللہ، سید محمد سعید خان دہلی والے اور سید میراں بن سید احسن قنوج والے قائل ذکر ہیں، اس کے علاوہ عبدالرحمن سیکری والا، میاں سید صدر الدین قنوجی اور سنبل کے میاں عزیز اللہ اور دیگر علماء ہمیشہ سلطان کے ساتھ ہوتے تھے جو اس معرکے میں شامل ہوئے۔ تحقیق کے بعد علماء کرام کا اس بات پر اتفاق ہوا کہ برہمن کو پاندھ کر (جس کردہ) اسلام کی طرف لانے کے لئے دعوت دی جائے اور اگر انکار کرے تو قتل کر دیا جائے قصہ مختصر برہمن، بوژہن اسلام نہ قبول کرنے کی پاداش میں قتل ہوا۔ سلطان نے بعد میں مذکورہ علماء کو انعام و اکرام سے لاد کر اپنے، اپنے شروں کی طرف روانہ کیا..... "سندھ میں کلموڑوں کے بعد میروں کے دور افتخار کے متعلق سچل اور سامی کے دور کے ایک انگریز مصنف ڈاکٹر برنس کے تاثرات خود اس قسم کی صورت حال کی نشاندہی کرتے ہیں - میروں کا ذکر کرتے ہوئے وہ انگریز ڈاکٹر لکھتا ہے وہ فطرتاً "نیک، بامروت، اور خوش اخلاق تھے پر مشرکین کے بارے میں سختی سے کام لیتے تھے۔ جنوب (لائز) علاقے میں کسی بد نصیب ہندو سے کوئی غلطی اگر سرزد ہو جاتی تو اسے کپڑہ کلمہ پڑھا کر ختنہ کروا دیتے۔ میروں کی زبردستی ان کی تبلیغی سرگرمیوں سے ظاہر ہوتی ہے۔

عقل اس بات پر حیران ہے کہ آخر اس ملک میں ہندو کیوں پڑے ہوئے ہیں! اس کا فقط ایک ہی سبب ہو سکتا ہے یعنی جنم بھومی سے ان کی محبت..... کمیں بھی دو مومن اگر کمیں شہادت دیں کہ کسی ہندو نے قرآن کی آیتیں یا کلمہ پڑھا ہے تو دو شہادتیں اسے ایک دم سنت بٹھانے کے لئے کافی ہیں۔ تاریخ سندھ کی یہ ایک ثابت اور تصدیق شاہ حقیقت ہے کہ ایسی ہی ایک مذہبی کدو روت والی روشن نے سندھ میں سینہ ناؤں مل جیسا ایک ندار پیدا کر دیا۔ اس سینہ ناؤں مل سے تمن صدیاں پہلے بھی

سندھ کو ایسا ہی قاضی قاضی بھی نصیب ہوا جو ایک بیرونی حملہ آور سندھ کے قاتل دشمن شاہ بیگ اور ارغون سفاک سے ہمنواں اور مدد کرنے پر آمادہ ہوا۔ یہی مذہبی عقائد کا اختلاف تھا جس پر بھروسہ کرتے ہوئے اکبر کے خون خوار پہ سالار، عبد الرحمن کو سندھ کے کچھ سجادوں اور خانقاہ نشینوں سے سندھ کو غلام در غلام بنا کر رکھنے اور سندھ کی عوام الناس کو لوٹنے کھوٹنے، اور کچلنے وغیرہ کے لئے دعائیں مانگنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور ان حملہ آوروں کو ان کاموں کے لئے وہ دعائیں اور دعاوں کے ساتھ امداد بھی ملیں!

شاہ، چکل اور سامی اپنے سماج کے حاس اور باخبر شاعر تھے۔ ان کو اپنے سماج کے دکھوں اور امنگوں کا علم تھا۔ انہوں نے اس کی امنگوں کی ترجیحی کی اور اس کے دکھوں کا علاج کیا۔ سندھی سماج کو ایک آزاد اور باعزت سماج بن کر رہتا تھا اس میں سے نفاق اور دوغلے پن کو ختم ہوتا تھا۔ اس کو نکراو (دولی) کی بجائے وحدت کی ضرورت تھے۔ اس میں اپنا اجتماعی وجود کا شعور ہوتا تھا۔ اس میں فرد یا گروہ کے مفادات کو جماعت کے مفاد پر قربان ہوتا سیکھنا تھا، یعنی اس کے سارے انفرادی اغراض کو ختم کر کے ایک اجتماعی اور جامع غرض کی صورت لیتا تھا تاکہ زیادہ سے زیادہ مفاد اور خود پسندیاں اس میں سما جائیں اور راضی ہو جائیں، اور یوں بلا خر اپنا وجود اس میں گم کر دیں۔ اس کے بستر شریوں کے دل میں فرض کا احساس پیدا ہوتا تھا جسے وطن دوست یا قوم کے لئے قربانی کا جذبہ کہتے ہیں، اور جو ہر باشور قوم میں ایک نسلی خوبی کی طرح موجود ہوتے ہیں۔ وہ روایجی طور پر تو دوسروں سے علیحدگی کا جذبہ ہوتا ہے جو اپنے نیس ہوتے، پر تربیت پائے ہوئے ذہنوں میں وہ کسی جامع مقصد سے وفاداری یا وابستگی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ سندھی سماج کو تاریخ میں اپنے لئے اعلیٰ مقصد کی حاصلات کا فرض قبول کرنا تھا، انسانی تہذیب کے خاص نمونے کے طور پر، اپنے مخصوص تہذیب و تمدن کر حفاظت و ترقی کا مقصد آج اس کے پر عزم دفاع اور اجتماعی حمایت کے بغیر ہو سکا

ہے اور یوں سحل محل کے خیر درج تک جا کر پہنچ سکتا ہے۔ اس کو اپنی بقاء کا حق ثابت کرنے کے لئے اپنی طاقت اور صلاحیت قائم رکھنی تھی، اس لئے کہ صرف مسلح جوئی سے تو میں کسی بھی مقصد کی صرف پیش قدمی نہیں کر سکتیں بلکہ اکثر صرف طاقتوروں اور بدمعاشوں کا لقہ بن سکتی ہیں اور بن جاتی ہیں۔ اس کو اندر وہی امن اور اتحاد کے لئے قانون اور انصاف کی بالادستی قائم رکھنی تھی اور مختلف خیالات و نظریات کے متصادم ہونے سے روکنے کے لئے برداشت اور رواداری کی فضا قائم کرنا اور ہمیشہ موجود رکھنا تھا۔ سندھی سماج میں نئے انسان کی تعمیر ہونی تھی، ایک ایسے بلند پایہ انسان کی تعمیر کہ جس کا آدرس اونچا ہو، جس کے خیالات بلند اور اعمال بھی ایسے ہی اونچے اور اعلیٰ ہوں، محبت، مرد، رواداری، صبر، حوصلہ، ہمت اور ایثار اور انتہک محنت کا مالک ہو، جو امن پسند، خیر اندریش ہو، جو محب وطن ہو، فرض شناس ہو، اور اپنے آزاد، کشادہ دل، اور باعزت سماج میں آزاد، پر خلوص اور باعزت زندگی بسر کرنے کے لائق ہو۔ شاہ، سچل اور سامی نے اپنے وطن عزز میں ایسا ایک سماج بنانا چاہا تھا اور اس میں ایسے ایک اعلیٰ انسان کی تربیت کرنا چاہی تھی۔

سندھ کے یہ عظیم شعرا، مذہبی لوگ تھے، خاص کر اس لحاظ سے کہ انسوں نے اپنے پیغام میں مذہبی اصطلاح کو بھی استعمال کیا۔ لیکن انسوں نے یہ پیغام سندھی زبان میں اہل سندھ کو دیا ہے جن کو اس کی ضرورت تھی۔ شاہ اور سچل کو بہت کچھ اسلام کے بارے میں سمجھانا تھا اور سامی کو بہت کچھ ہندو دھرم کے متعلق، اور ان تینوں شعراء کو خالص مذہب کے (ان دیکھئے میں) ایمان والے اصل اور الاصول کو بھی سمجھتا اور سمجھانا تھا۔ مقصد ان کی اس کوشش کا یہ تھا کہ سندھ کے لوگ محسوس کریں کہ مذاہب خواہ خواہ ان میں کوئی دوری نہیں پیدا کرتے، خاص کر جب ان کو عقل کی آنکھ سے دیکھا جائے، یعنی تمذیب سے جس قدر ان کا واسطہ یا اشتراک تھا اتنی حد تک وہ ان کو جوڑ کر رکھ سکتے تھے اور جوڑے ہوئے تھے۔ ان کا یہ رابطہ ان کے سماج کے لئے

ایک بڑی نعمت تھا بلکہ وہ ان کے وجود کے بقاء کی ضمانت ہو سکتا تھا۔ مگر ریاست یعنی سرکاری اقتدار کے معاملے میں یعنی اس کی شرکت کی وجہ سے ان میں سے ایک کی فوتیت اور زیادتی ان میں نفاق کا موجب بن رہی تھی، جس نفاق کی وجہ سے ان کو یعنی ان کے سماجی وجود کو کبھی کوئی فائدہ نہیں مل سکتا تھا بلکہ پلا خر اس کے نتیجے میں اسے سماج ہو کر زمین بوس ہونا تھا، اور اس صورت میں ان کا باقی وجود انسانی دنیا میں بیکار بنے یعنی اور وقار سے خالی ہو جانا تھا۔ تاریخ نے اہل سندھ کو شاہ کی زندگی ہی میں ثابت کر دکھایا تھا کہ کس طرح جھوک کے صوفی مجاہدوں اور حکمران کلموڑا فقیروں کے مابین مذہبی اختلاف اور نفاق نے سندھ کی آزادی اور قومی بحالی کو بس چھپے دھکیل دیا، اور اس میں برس کی محرومی نے انسان کی بُنیٰ بُنا کی قسمت کو جس طرح سے بدیختی میں بدل دیا اور اس کا کوئی اندازہ ہی نہیں لگا سکتا۔ چل اور سامی کی زندگی ہی میں سندھ کے لوگوں نے دیکھا کہ مذہبی کٹرپن نے کس طرح ان میں ”ناوں مل“ کو پیدا کر کے ان کی سو سالہ غلامی کے لئے سرزین ہموار کی، جس کی ابتداء سامی نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔ اپنی جدید تاریخ میں اہل سندھ نے دیکھ لیا کہ دونوں فریقوں کو بدلتے میں سوائے ہولناک خوف اور بے بی کے اور کچھ نہ نصیب ہوا۔ اہل سندھ کے سامنے ان کی بھلائی کی وہ راہ ہو جو ان کے عظیم شعراء نے ان کو دکھائی، روادری، محبت اور اتحاد کی راہ، وہ آج بھی ان کے سامنے موجود ہے اور آج بھی اس پر چل کر وہ اپنا طاقتور، خوددار اور باعزت سماج قائم کر سکتے ہیں اور وسیع انسانی برادری میں اپنی مخصوص تہذیب کی حفاظت اور بہتری کے اعلیٰ فرائض کی بجا آوری کر سکتے ہیں۔

فن اور شعر کے مطالعے میں عام طور پر، اور ہمارے ہیں خاص طور پر شاہ چل اور سامی کے مطالعے میں، ان کے فن اور اشعار پر مذہب کا عضر زیادہ تلاش کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے۔ مذہب کا فن اور شعر پر اثر انداز ہونا اپنی جگہ مگر فن اور شعر کا مذہب پر اثر بھی کافی گمرا ہوتا ہے، بلکہ پوری کی پوری تہذیب یعنی کسی خاص سماج کے مادی

اور زہنی (روحانی) تحقیق کا اثر مذہب اور ریاست دونوں پر ہوتا لازمی ہے، اور ان پر کن حالات میں تھوڑا یا بہت اور کن حالات میں پوری طرح اپنی قومی تہذیب کا ریگ غالب ہوتا ہے۔ قومی تہذیب اور قومی ریاست کی طرح مذاہب بھی قومی ہوتے ہیں، چاہے وہ کسی "عالمی مذہب" کے "ملحدانہ" یا بدعتی تغیرتی کیوں نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ رائخ "پختہ" عقیدے والوں نے مذہب کو تہذیبی یعنی "افادہ عام" والے (محترک، ذی روح) ہر تغیر کو کفر اور الحاد کہا ہے۔ سندھ دشمن شاہ بیگ ارغون نے سندھ کے فدائی، شہید اعظم، مخدوم بلال کو کافر کملوا کر کوئلوں میں پوسایا۔ شاہ عنایت شہید پر برہنی سکوار بردار جلاود کھڑا کر کے نواب اعظم خان نے پوچھا کہ "اولو الامر" کے حکم سے تم نے منہ کیوں موڑ آئی؟" شاہ عنایت شہید نے جواب دیا "ہم مرید کعبے کی طرف کس طرح منہ کر کے کھڑے ہو سکتے ہیں، جبکہ ہمارے ہادی کامنہ میں خانے کی طرف ہو!" سندھ کے اس امر شہید کا سرت سن سے جدا کرنے کے بعد نواب اعظم خان نے شر میں منادی کر دیا کہ کوئی بھی آدمی "یا اللہ" کا نعرو نہ لگائے، حکم عدوی پر سکوار سے اس کا سر تن سے جدا کر دیا جائے گا، اس لئے کہ "یا اللہ" شاہ شہید اور اس کے وطن دوست مجاہدوں کا نعرو تھا۔ شاہ شہید کے وقت شہادت پر شاہ بھٹائی اپنی بھرپور جوانی میں تھے، اس وقت ان کے دل سے جو آہ نکلی ہمیں معلوم ہے "جھجھل پیسو جھوک آیل سگھارن جی!" اور میں اپنے سانس سے پیاروں کی جھوک (بینھک) سیکھ کر میرا دل خون میں گھلتا ہے اور انسو بھاتی ہے۔ شاہ سائیں کے یک در رہم عصر اور محب وطن درویش "حضرت خواجہ محمد زمان لنواری والا" تھا جس کی مطاقت کی یاد میں ان کا ایک بیت مشور ہے۔

موں سے ڈُٹھا ماء، جنیں ڈُٹھو پریں ؎ کھے
تئیں سندی کاء، کرئے نہ سگھل مکھڑی
(اویل) میں نے وہ دیکھے جنوں نے پیار کامنہ دیکھا مجھ سے تو ان کی صرف بات

بھی ہو نہیں پاتی۔)

حضرت خواجہ صاحب کے بارے میں ایک بلت مشور ہے کہ ”ایک مرتبہ ان کے ہاں ایک ہندو آیا اور منت کی کہ تبا اس بندے کو اسم اعظم کی ہدایت کریں! حضرت نے ان کو ہدایت کی، جب وہ جانے کے لئے اجازت لینے لگا تو حضرت نے اس سے فرمایا ظاہری طور پر تم بے شک ہندو دھرم کی کریا کرم کرتے رہو مگر باطنی طور پر جو ہم نے تمہیں امانت عطا کی ہے، وہ حفاظت سے رکھنا، یہ لفظ سن کر حافظ پونحو ہائی ایک ہیش نے اعتراض کیا کہ قبلہ یہ بھلا کس قسم کی مسلمانی ہوئی؟ حضرت خواجہ نے اس کی طرف آنکھیں اٹھا کہ فرمایا میاں، مسلمانی کر تجھے کیا خبر؟“ حضرت خواجہ سے یہ بھی قول منسوب ہے کہ ”دین قائم ہے حق کے لوگوں سے نہ کہ لاٹھی اور لڑائی سے“ ظاہر ہے کہ سندھ کے محب وطن سے سلطان جام نظام الدین اور سندھ کے دشمن شقی القلب اور اہل سندھ کے قاتل سنگ شاہ بیگ ارغون کا دین و مذہب ایک نہیں ہو سکتا، اور نہ ہی مخدوم بلال اور قاضی قاصن کا یا نواب اعظم خان اور شاہ شہید صوفی کا مذہب ایک جیسا ہو سکتا ہے۔ جن ملاؤں اور مفسیوں نے ”ایمان والی“ ہندو عورت اور بنیے بل چند کو زبردستی مسلمان کیا، ان کا اور سلطان الاولیا خواجہ محمد زمان لنواری والے کا مذہب بھی تو ایک جیسا نہیں ہو سکتا جن سے اپنے ایک ہندو معتقد کو اسم اعظم کی امانت دے کر کہا کہ چاہو تو تم ظاہری طور پر ہندو کریا کرم پر قائم رہ سکتے ہو۔ ”یحفت الکرام“ میں تھنھے کے ایک ”اہل حال“ بزرگ شاہ اسماعیل صوفی کا ذکر ہے کہ وہ شاہ شہید صوفی کے علصیں میں سے تھے اور شاہ عبدالطیف بھٹائی کا ان سے یارانہ تھا اور وہ مشنوی کا درس بڑے انہماں اور محنت سے دیتے تھے..... ایک مرتبہ درس دیتے ان کی طبیعت پریشان ہو گئی اور پورے بدن پر نیل پڑنے لگے جن کو چھپانے کے لئے رلی منگوا کر اوڑھ کر بیٹھ گئے۔ آخر ماجرہ یہ معلوم ہوا کہ ”اس وقت قاضی شر تھنھے کے کوتولی میں چبوترے پر ایک شخص کو سرکاری ملازموں کے ہاتھوں بغیر کسی جرم کے صرف سیاہی

ضد کی بنا پر کوڑے لگوائے جا رہے تھے، اور وہ کوڑے اس بزرگ کی پیٹھ پر نمودار ہو رہے تھے۔ یہ تو یہ کہ ”ابل حل“ بزرگ شاہ اسماعیل صوفی کا مذہب کچھ اور تھا جس کے ساتھ سرکاری ابل کار ہم صلاح اور سمت تھے یا جن کے ساتھ وہ سمت اور ہم صلاح تھا، کہ جو کھڑے ہو کر ایک بے گناہ کا خواخونہ کوڑے لگوا رہا تھا۔ شاہ بیگ ارغون، قاضی کا قائم نواب اعظم خان، نٹھنہ کا قاضی اور دوسرے فتویٰ باز ملاویں اور مولویوں کا مذہب وہ ہی تھا جو غاصب، ہڑپ کرنے والے اور قابض گروہی مغادر اور ان کے ریاست اقتدار کو ہتھیار کے طور پر کار آمد ثابت ہو رہا تھا۔ اور جام نظام الدین، محمود بلال، شاہ شہید، خواجہ محمد زمان، شاہ اسماعیل صوفی، اور دوسرے ”ابل حل بزرگوں“ کا مذہب وہ تھا جو ”افادہ عام“ کے رنگ میں رنگا ہوا تھا، جس میں وقت کی حالتوں کا اثر دیکھنے میں آ رہا تھا، جو سندھی لوگوں کے تندیب سے ہم آہنگ ہو رہا تھا، اور ان کے قومی مذہب کا روپ دھار رہا تھا۔ شاہ شہید صوفی جس کے لئے کہا گیا ہے کہ خود بھی برا شاعر تھا اور راگ کا متوا لا تھا، شاہ اسماعیل صوفی جو مشنوی روم بڑی محبت سے پڑھتا تھا، خواجہ زمان جو خود بھی شاعر تھا، اور جمیل و شفیق ساتھ کے دوسرے بزرگ مثلاً ”نٹھنہ“ کے محمود محمد معین، سون کے محمود میاں دین محمد، احمد کوٹ کے محمود میاں پیر محمد، کوڑی کبیر کے محمود میاں محمد، روہڑی کے میر جان اللہ شاہ رضوی، گھومنگی کے میاں موسیٰ شاہ جیلانی، اور کئی اس کے دوسرے ابل دل اور ابل حل بزرگ، صوفی باصفا اور عالم باعمل پورے سندھ میں سائیں کے نہ صرف ہم عصر دوست بلکہ ساتھی بھی تھے، جن سب نے سندھ اور سندھی سماج کی قومی بحالی اور قومی بقاء کے لئے سندھی عوام کا قومی اتحاد قائم کرنا چاہا، یہ اتحاد وہ سندھی عوام کی قومی تندیب کی بنیاد پر قائم کرنا چاہ رہے تھے، اور دعویٰ اور دستور والے مذہب کی کوئی بات جو اس اتحاد کی راہ میں رکاوٹ کا موجب بن رہی تھی اسے انہوں نے ہٹانا چاہا تھا، بلکہ ریاست اور مذہب دونوں کے لئے وہ چاہتے تھے کہ تندیب کے ضابطے اور تاریب تحت رہیں اور اس کی

ترقی و تعمیر کے کام آئیں۔ وہ سندھی لوگوں کی اجتماعی قوت کو قومی ریاست کا اور ان کے کثیرالا عقائدی کو قومی مذہب کاروپ رہا چاہتے تھے، مگر ان کے قومی اتحاد کے سامنے کوئی خطرہ باقی نہ رہے اور وہ اپنی مادی اور روحانی فلاح اور ترقی کی راہ میں کامل بھروسے اور بے خوف سے آگے بڑھنے اور نئی نوع انسان کی آفاقی صرت اور کمال میں اپنی بساط کے مطابق اپنے حصے کا فرض ادا کر سکیں۔ حضرت شاہ عبدالطیف بھٹائی اپنے دور کے سندھ اور سندھی سماج کی اس پوری امنگ کا عظیم ترجمان یعنی ان کا عظیم شاعر، عظیم فنکار اور عظیم مفکر تھے۔ چل اور سامی بھی سندھ اور سندھی سماج کی اس اجتماعی امنگ کے عظیم ترجمان اور شاعر تھے۔

سندھ کے محب، ایچ، لی سورے نے، اپنی بہت اچھی کتاب Latif of Bhit Shah Abdul کے تاریخ دالے حصے کے شروع میں انگریزی کے دو چھوٹے شعر لکھے ہیں۔

ایک آئزک والٹس (Issak Watts) کا
”وقت“ ایک سدا بنتے ہوئے دریا کی مانند ہے
اپنی ساری پود کو اپنے ساتھ بنا کرنے جاتا ہے
ایک خواب کی مانند وہ اڑتے اور فراموش ہوئے جاتے ہیں
جو صحیح ہوتے ہی گم ہو جاتا ہے۔“

دوسرा ٹینسین (Tennyson) کا

”دن اپنی پوری امنگ تریک کے ساتھ اڑتے اڑتے گم ہوتے جا رہے ہیں، مگر شاید ایک کوئی باقی رکھنے والی اور اک ہے، جو کبھی کبھی نکل کر لادیتی ہے (اسے بھی خبر نہیں کہیں سے)

ایک چھوٹا سا مدد بھرا پیالہ، ایک پر کیف نیبی چکلی!
وقت مستقل گزرتا جا رہا ہے، دن برابر گزرتے جا رہے ہیں، مگر ماضی کے

چھوڑے ہوئے ڈھیروں میں بھی تلاش کرنے پر کچھ ایسے ہیرے کبھی کبھی مل جاتے ہیں، جن کے کردار کی سب سے اہم شادت یہی ہے۔ اس طرح شاعری جو کسی قوم کے روحلانی حافظے (اس کی زبان جس کا لامہ ہے) میں موجود ہے، وہ ہی اس کی تذہی ارتقائی کتاب ہے، اس کی اصلی تاریخ ہے، جس کا اس قوم کے بننے اور کامیابی سے زندہ رہنے اور زندہ رہتے ہوئے آگے بڑھنے اور بلند ہونے میں بڑا ہاتھ رہتا ہے۔ شاہ، پھل اور سائی کی اعلیٰ شاعری، اپنے چج، نیکی اور کمال حسن سے سندھی زبان میں محفوظ ہے، اور سندھی زبان ان کی فکر اور فن کی قوت سے آج سندھیوں کے اجتماعی وجود اور اس کے اتحاد و بقاء کا نشان اور اس کا بنیاد اور ضمانت ہے۔ ان کا یہ احسان کہ انسوں نے سندھ اور سندھی سماج کی اس اپنی زبان کو اپنی روح کی آزاد امنگ کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے، اور یوں اس کو اتنی توانائی، کشش اور وسعت دی کہ وہ سندھیوں کی قوم بننے میں اپنا تذہی کردار ادا کر سکی۔

شاہ، پھل اور سائی سندھی قوم کے استاد، اور رہبر ہیں خاص کر شاہ صاحب نے سندھی قوم کو اپنا رسالہ عطاء کر کے ان کو "اہل کتاب" ہونے کا شرف بخشتا ہے۔ یہ اپنی چیز کو عظمت یا تقدس دینے کی بات نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ "شاہ جو رسالو" دنیائے جملہ مذاہب کا نچوڑ اور ستم ہے اور سندھی تہذیب کی ساری حاصلات کا روح ہے۔ اس میں زنداؤ ستا، گیتا، بدھ دھرم، جین مت، مسیحیت اور اسلام کی تعلیم کے اہم اور اعلیٰ اصول اور قدriں سب موجود ہیں جو یوں بھی بنیادی طور پر ساری ایک سی ہیں۔ اس کے کتنے ہی سر علیحدہ علیحدہ اور سارے کے سارے یا حصوں میں ان مذاہب کے اپنے، اپنے تربیتی ماہول اور تعلیمی اصطلاح پر مبنی نظر آتے ہیں۔ سندھی تہذیب نے زنانوں کے سفر کی یاد انمول سرمائے کے طور پر اپنے پاس اپنی لوک کوئا، لوک کتخا اور لوک کماوتوں کی صورت میں محفوظ کر رکھا ہے۔ انہی مثالوں، باتوں اور واقعات کے مطالعے سے اخذ کئے ہوئے عام نتائج اور عام اصول شاہ صاحب نے اپنے رسائلے میں

سندھی لوگوں کو سکھائے ہیں عالم آگھی کے عمل کلیہ ہی ہوش مندانہ اور دپنڈر طریقہ ہے۔ مکمل آگھی اور مطلق علم کبھی ممکن نہیں، اس لئے علم کے حاصلات کا تذہی یعنی تجرباتی اور آزمائشی طریقہ مذہبی طریقہ یعنی اعتقادی یا ایمانی طریقہ سے زیادہ قابل اعتبار اور زیادہ باشیر سمجھا گیا ہے اور ثابت شدہ ہے۔ تعلیم کے تذہی طریقے میں شک اور علم کی حاصلات کے لئے اولین اقتداء شمار ہوتے ہیں۔ شک یا تنقید میں سے چج، نیکی اور حسن کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا، اس لئے چج اور نیکی کا دویے بھی وقت پر ہی داروددار ہوتا ہے، خود ضمیر پر بھی وقت کا اثر ہوتا ہے۔ مگر وجوہات تذہی ارتقاء کے لئے ضروری ہے اور ہر طرح سے عظیم ہے وہ چج، نیکی اور حسن سے چاہت کا جذبہ خاص طور پر تب جب اس کے لئے خطرے کا سامنا کیا جائے۔ شاہ سائیں نے اپنے رسالے میں سندھیوں کو انہی کی اصطلاح میں ان کی اپنی مثالوں، باتوں اور واقعات کے ذریعے اسی چج نیکی اور حسن سے محبت کے جذبے کی ترتیب دی ہے۔

نکو سندھو سور جو نکو سندھو سک
عدد ناہ عشق پچانی پان لے سندھو سک
(مصائب کی انتہا نہیں تو ذوق طلبی بھی انتہا نہیں، عشق کے آگے عدد نہیں ہوتا
اپنی منزل وہ آپ ہے۔)

چج نیکی اور حسن، حق، خیز اور جمال، انسانی روح کے لئے تین بنیادی امنیتیں ہیں اور ان کی بنیاد اصل میں انسان کے اپنے ذاتی مفاد پر رکھی گئی ہے۔ جو کچھ میرے اپنے فائدے کے لئے ہے، وہ میرے لئے حق بھی ہے، خیر بھی ہے اور اس میں مجھے حسن بھی نظر آتا ہے کیونکہ وہ مجھے اچھا لگتا ہے! مگر انسان یعنی فرد دنیا میں اکیلانہ نہیں اور ایک ذاتی مفاد دوسرے ذاتی مفادات کے تعلق اور نسبت سے عملی صورت لیتا ہے، اس لئے اگر محض زور (انفرادی یا مگروہی) پر فیصلہ چھوڑنا نہیں تو بھی کتنی۔ انفرادی یا مگروہی مفادات کو "مل جل کر گزارنے" کے لئے "لین دین اور چھوڑنا چھڑوانا" کے طریقے

سے، "جو اور جینے دو" کے اصول پر عمل لازمی بن جاتا ہے۔ اسی طرح "میری" ان کی "انفرادی یا گروہی نوع کی) بت سچائیوں کے نجع باہمی برداشت اور رواداری کے اصول کے سوا اور کوئی راہ نہیں۔ اور ان کی اپنی بقاء اور فروغ کے لئے بھی یہ واحد معقول اور مفید راستہ ہو سکتا ہے، 'برداشت' اور جو اور جینے دو کے اصولوں پر عمل کرنے سے باہمی تعاون اور باہمی محبت بڑھتی ہے اور انسانوں میں ہر سطح کے گروہی اتحاد، امن، اور محبت بڑھتی ہے اور انسانوں میں ہر سطح کے گروہی اتحاد، امن، اور ترقی کی راہ بنتی ہے۔ اور انیں نفاق، جنگ کی ہولناکیوں سے تحفظ اور پناہ ملتی ہے، اور یوں تہذیب کے مذہب اور ریاست پر فوتیت کی صورت قائم ہوتی ہے، اور سماج سے غالب مذہب کے تعصباً اور ہٹ دھرمی سے ایک طرف اور کسی غالب ریاست کے ظلم و تشدد سے دوسرا طرف اور دونوں کی متحدہ موت جیسے عذاب سے (پوری طور پر نہیں تو بھی) بت حد تک نجات حاصل کرتا ہے اور یوں ادھر اس دھرتی پر وہ کامل انسان مرت اور انسانی خیر کی جنت کی تعمیر میں اپنے حصے کا فرض ادا کر سکے گا۔ اور یہی ہر انسانی سماج کی ہر فرد کا دھرتی پر اعلیٰ مقصد ہو سکتا ہے۔

سندھ کے لوگوں اور سندھی سماج کو شاہ، چل اور سماں نے اس دھرتی پر اس اعلیٰ مقصد سے روشناس اور اس کے لئے اسے تیار کرنا چاہا تھا۔ وہ سندھ کے استاد، ہادی و رہبر تھے۔ اور انتہائی بڑے انسان اور انتہائی بڑے شاعر تھے۔ انسوں نے سندھی سماج کو ایک نئی اجتماعی وحدت کے شعور سے واتفاق کیا، اور اس کے لئے اسے عملی راہ دکھلائی، 'قومی تہذیب، قومی مذہب اور قومی سیاست کی راہ، مشترکہ مفاد اور باہمی تعاون کی راہ، محبت رواداری اور اتحاد کی راہ، عمل اور قربانی کی راہ۔ ان کے سامنے سندھ اور سندھی سماج کے آزاد باؤقار، بامقصد اور خوشحال وجود کا خواب تھا۔ ان کے ہل اس خواب کی تحریکیں کا راستہ بھی تھا، دو غلے پن اور دوری کو ہٹانے کا، اپنوں کو اپنانے کا، کیجا ہونے کا، سچ نیکی اور حسن سے خود وابستگی اور ان پر خود کو پنجاور کرنے کا، پچھی انسانیت کا، آدمی

کی عزت اور مان اور انسان کی سیوا اور پیار کا، انسانی تندب کے عروج میں اپنے حصے کافرض ادا کرنے کا، عالی امن، اتحاد اور ترقی کی جدوجہد میں حصہ دار ہونے کا۔ اب یہ ہم پر مخصر ہے کہ کسی حد تک اہم اپنے اس فرض کو پہچانتے ہیں اور اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں اور کسی حد تک اپنے آپ کو عظیم استادوں اور راہبروں کے لائق ثابت کر سکتے ہیں۔

ساری بات کا دارود اس پر ہے کہ ہمیں اپنے آپ پر کتنا فخر ہے، کتنا اعتماد ہے، ہم ایک دوسرے سے کتنے چھے ہیں اور اپنی روح کو زندہ رکھنے کے لئے کتنا کچھ برداشت اور قربان کرنے کے لئے تیار ہیں۔ خدا کرے ہمارے جینے کی منطق ہم سے کبھی نہ بھولے، اور اپنی صلاحیت اپنی غیرت اور اپنے مان سے جینے کی امنگ ہمارے روح میں موجود رہے۔

پسی جھاجھ جمل جی جسمیں پیتی پک
اپر آگا منحو تھیو سوا انھیں کھے سک
(دور جو لوگ جلوہ جمل دیکھ کر اس کے گردیدہ بنے، آلام مصائب سہ کران
ذوق جمل اور بڑھا کوئی بات ان کو ماندہ نہ کر سکی، اس روی جمل کی طرف وہ بڑھتے نہ
گئے)۔

امدادی کتب

- ۱- "تاریخ معصومی" (سنڌی ترجمہ مخدوم امیر احمد)، سنڌی ادبی بورڈ
- ۲- "بخت الکرام" (سنڌی ترجمہ مخدوم امیر احمد)، سنڌی ادبی بورڈ
- ۳- "منظر شجاعی" مبرک یوسف، تصحیح و مقدمہ و حواشی پیر حسام الدین شاہ راشدی
- ۴- "منشور الوصیت و دستور الحکمت" میال نور محمد کلموڑو، تحقیق پیر حسام الدین شاہ
سنڌه ادبی بورڈ
- ۵- "تاریخ سنڌه، عمد کلموڑا" (دوسری جلد)، غلام رسول "مر"
- ۶- "شاہ عنایت اللہ اور ان کے ساتھی و ہم عصر" مولانا غلام قاسمی، ایضا
- ۷- شاہ عنایت شہید کی سوانح کامانخذ، پیر حسام الدین شاہ راشدی، "عنی زندگی" ماہنامہ،
شہید نمبر ۷۹۰۷
- ۸- "شاہ شہید عنایت اللہ صوفی" ڈاکٹر داؤد پونا، ایضا
- ۹- "شاہ شہید صوفی" محبوب علی مچنا، ایضا
- ۱۰- "بیاض ہاشمی" (قلمی) مخدوم محمد ہاشم تھٹھوی۔
- ۱۱- "پیغام لطیف" جی، ایم، سید

- ۱۳۔ (۱) "شہ" (۲) "چل" (۳) "سہی" کلین آدوانی
 ۱۴۔ "سامی کا سلوک" (تیری جلد) بی، اچ، گرانی
 ۱۵۔ "شہ ہو رسالو" کلین آدوانی
 ۱۶۔ "رسالو کوثر (اردو) محمد اکرم
 ۱۷۔ رود کوثر (اردو) محمد اکرم
 ۱۸۔ رود کوثر (اردو) محمد اکرم

17- "Shah Abdul Latif of Bhit" H. T. Solrey.

18- "Sind and its Sufis" J. P. Gularaj.

19- "Sind Before the Muslim Conquest" H. T. Lambrick.

20- "Reflection on History" Jacob Burckharebt.

21- "Peotics and Rhetoric" Aristotle.

22- "To the Nations" Paul Richard.

23- "Patriotism in Literature" Jhon Drinkwater.

24- "Cropsin Sind" A. W. Khoso.

ہم اور شاہ

شاہ عبدالطیف بھائی سندھ کے مبارک اور دنیا کے عظیم انسان تھے۔ سندھ کے لئے شاہ کا پیغام اتحاد کا پیغام ہے۔ انسانوں کے اتحاد اور عمل سے ہی انسانوں کی قسمیں بنتی ہیں۔ اتحاد ہر حالت میں کسی مقصد کے لئے ہوتا ہے انسانوں معاشروں اور قوموں کے اتحاد کا مقصد اجتماعی مفاد ہوتا ہے۔ اجتماعی مفاد کے لئے انفرادی اور گروہی مفاد قریب کرنے پڑتے ہیں۔ آج کی وسیع آبادیوں والی اور علم ہنر سے بھری ہوئی دنیا میں معاشرہ یا قوم کے اجتماعی مفاد کا مطلب اکثریت کا مفاد ہے۔ دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح سندھ میں بھی اکثریت محنت کش عوام کی ہے، ہاریوں، مزدوروں، کمیوں اور کاسیوں اور دوسرے کئی محنت کش لوگوں کی۔ کمانے والے اور پیدا کرنے والے وہ ہیں، اور پانے والے کھانے والے دوسرے ہیں (جو کہ بہت کم تعداد میں ہیں۔ شاہ صاحب نے اپنے تمام رسالے میں سب سے زیادہ ذکر ایسے ہی اکثریت عوام کا کیا ہے۔ یعنی ہاریوں اور دستکاروں کا کائٹنے والوں، لوباروں، کمحاروں، مہانوں اور کشتیانوں کا، اوڑوں اور دھناروں کا دستکاریوں اپنے عام غریب اور مسکین بہائی بھائیوں کا۔ اسی لئے شاہ کا پیغام ہمارے لئے آج بھی وہی ہے۔ کہ ہم اپنے مشترکہ اور بڑے مفاد کے لئے، یعنی سندھی

سماج کی اکثریت کے مفاد کے لئے اپنا الگ الگ چھوٹے اور محدود مفاد کو بھول کی آپس میں متعدد ہونا چاہیے۔ سب کے مفاد کے لئے، سب کے اتحاد، اکثریت کے مفاد کے لئے اکثریت کا اتحاد قائم کریں۔ کیونکہ لٹھے ہوئے اور پے ہوئے، کیونکہ محروم و مجبور، مصائب کے شکار اور دکھی وہ ہیں، اور دکھی حالت کو بدلتی کے لئے وہ بھی آپس میں ملنگے، متعدد ہوں گے اور عمل کے لئے اٹھیں گے اور جدوجہد کریں گے۔

”کیون جان نہ مژن“ تین تین پی اندھی

• ٹی واریون پڑیون، گپاڑھا گپل سندن

پیون ٹھن پیٹھ ٹھن، روئندیون روں واریون

روہ بند رجن کپسی، سکالا نامر سھو،

کپروکن کریں، جن مائی ا مجھنے محی،

ایڑو دور سکھی، تبدنه کبھی ناکڑا

ٹھن ٹھکل، سای سارن ما بھیاں ای مرک

و جھن عونہ فرق، رک وھندی ۽ راندھ“

لیاقت میدیکل کالج کی ”ڈیس میزن اور لطیف تحفہ۔ ۱۹۷۷ء“

”..... دیکھنا یہ ہے کہ مذہب کا اقتدار کی دنیا یعنی سیاست میں، اور اخلاقیات کی دنیا میں، تاریخی عمل کیا رہا ہے؟ اقتدار کی دنیا میں اس نے انتہائی شدت اور سنگدلی سے کام لیا ہے۔ لازمی طور پر اسے ایسا ہی کرنا تھا کیونکہ مذہب تو اپنے معنوں کے مطابق اپنے معتقدین پر جن کو اس سے چے ایمان کی روشنی مل رہی ہے، یہ فرض عامد کرتا ہے کہ وہ کافروں کو کفر کے انہیں سے باہر نکالیں۔ اس کے علاوہ، ایمان کی اس روشنی کا تعلق جسم سے زیادہ روح سے ہے، اور تاریخ نے اس حقیقت کا ثبوت ہیشہ کافروں کے خون اور گوشت یعنی ان کی لاشوں کی صورت میں دیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ کہ جو لوگ چے دین کی روشنی سے انکار کرتے ہیں وہ بہر حال اس بات سے بھی انکار کریں گے کہ مومنوں کو ان پر حکومت کا حق ہے۔ بس اسی مقدس ایمان کی روشنی اور مقدس کتب کی تبلیغ سے دوسرے ممالک میں مومن قوموں کے لئے اور حکمرانی کے جھنڈے گاڑنے کا مکمل جواز اور لا جواب سبب پیدا ہوتا رہا ہے۔ ایسے میں اگر چند داعی، مبلغ، درویش اور عالم مخصوصی طور پر اخلاص اور پاکبازی کے پتلے تھے بھی تو اس سے اصل بات میں کوئی فرق نہیں پڑتا، بلکہ یہی پاکبازی اور بے لوث ہونا قوت اور اقتدار کو تحفظ اور تقدس کا کام رہا جب ان کے دوسرے مومن بھائی ایک قوت اور اقتدار کو پوری تندی اور جوش سے استبل کرتے رہے کہ وہ اپنے اس جہاد کے عیوض جنت

کے مالک اور وارث بن سکیں گے، آخرت کی جنت سے زیادہ اس دنیا کی جنت کے غلاموں کے، باغوں کھیتوں دریاؤں اور وادیوں کے، حکوم قوموں کی محنت مزدوری اور خون پینے کی جنت کے مالک اور وارث۔ مقدس دین اپنے ان چند نیک اور متقدموں اور درویشوں سے تقریباً لاتعلق اپنے ان جنت پسند مجاہدین کی ہر فتح پر حاصل کردہ مل غنیمت کو اپنے خدائے قدوس کی طرف سے مومنوں پر لازوال فضل و کرم کی بارش اور اس کا احسان عظیم کرتا اور ظاہر کرتا رہا، وہ اپنے خدا سے ان کا خدا ان سے خوش تھا۔ اس طرح اخلاقیات کی دنیا میں ایک تو نہب اپنے معتقدین کے ذہن میں یہ غور پیدا کر دتا ہے کہ ان کا کردار اور ان کے اخلاقی اندار اور دوسروں سے بلند اور اعلیٰ ہیں، اس لئے ان کا یہ حق بجانب ہے اور فرض بھی کہ دوسروں کے عقیدوں کو بدليس اور انہیں راہ راست پر لانے کی کوشش کریں، اور اس کام کے لئے وہ ہر قسم کے طریقے استعمال کرنے میں حق بجانب کریں، اور دوسرے یہ کا انسانی تذییب کے ان اختلافات اور تنازعات کو حل کرنے میں مومنوں کے عقیدہ پرست اور خود پسند جنون نے انسانی اخلاقیات کو ناقابل عبور اور پر فریب روپ دے دیا ہے جیسا سمندر کب ناقابل عبور تھا اور جیسا آج بھی وہ پر فریب ہے۔ اس لئے ہم پورے اعتماد سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو بھی اگر چاہے کہ حققتاً "ایک نیک اور با اخلاق انسان بن کر رہے (ہمیں دل میں ایسا کوئی شک نہیں لانا چاہیے کہ با اخلاق اور نیک بننا ممکن بھی ہے یا نہیں، بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اس بات پر پورا یقین ہونا چاہیے کہ ایسا ممکن ہے) تو اسے سب سے پہلے اس ایمان کے منع ناموں، گناہوں اور مناقتوں سے خود کو سچیح کر الگ کرنا ہے۔ تحقیق، اگر خدا کے تصور یا مفہوم میں کوئی سچائی یا کوئی افادت ہے، تو وہ یہی ہو سکتی ہے کہ اس کی مدد سے ہم اپنے اندر دل میں زیادہ کشادہ اور زیادہ آزاد اور زیادہ پیار کرنے والے انسان بنیں۔ اگر خدا ہمیں ایسا نہیں بنا سکتا، تو پھر بہتر ہے کہ ہم اس کا نام لیتا چھوڑ دیں۔"

جس میں بالٹون (ایک امریکی سیاہ فلم پادری)

حوالہ

FreedoM Reason or revolution

ایڈیٹر مگارڈن بوکر، روچیج اسند پال کامن یمیٹڈ، لندن، ۱۹۷۰ء
 شاہ لطیف پر تحقیق کرنے والوں نے ان کی تاریخ پیدائش کے بارے میں اختلاف
 کیا ہے۔ ڈاکٹر ڈرمپ نے شاہ کا سن ولادت ۲۸۸۰ء ڈاکٹر لیلا رام نے ۲۸۸۸ء علامہ آئی
 آئی قاضی نے ۲۸۸۹ء تحریر کیا ہے اور غالباً یہی درست معلوم ہوتا ہے۔ شاہ صاحب
 کے سن وفات جس پر سب متفق ہیں ۱۷۵۲ء ہے۔ شاہ صاحب کے ہم عمر شعراء میں
 پشتو کے خوشحال خان خٹک، پنجابی کے بلحے شاہ، سندھی کے چکل اور سامی، اردو کے
 ولی دکنی، شاہ مبارک آرزو، ظہور الدین حاتم، اور مرزا جان جال اس مظہر شامل ہیں۔ شاہ
 عبداللطیف بھٹائی کے دور کلموڑا حکمران یار محمد اور اس کے بیٹے نور محمد کے اودا
 حکومت پر محیط ہے رعنانا حید مضمون ”شاہ لطیف کا پیغام“

(روزنامہ جنگ، ۱۹۳۸ء)

”..... جیسا کہ تاریخ طاہری، وغیرہ میں آیا ہے مذکورہ سید (قاضی سید شمس اللہ
 شیرازی) ۹۰۶ء ہرات سے قندھار وہاں سے شاہ بیگ کے حکم سے ۹۲۷ء میں (جس سل
 شاہ بیگ نے سندھ پر حملہ کیا تھا) تختہ آئے اور مرزا شاہ حسن ابن شاہ بیگ کے
 زمانے میں (یعنی دوسرے سل جب شاہ بیگ کے مرنے کے بعد شاہ حسن نے اس کی
 گکھ لی)۔ اس نئی فتح کردہ سر زمین کے منصب قضاۓ سرفراز ہوا۔ شروع میں وہ تاجر
 کی حیثیت سے آئے تھے۔

”..... بزرگوں سے سنا ہے کہ جمال موصوف نے آکر سکونت اختیار کی ان کی

اولاد آج تک وہیں رہتی ہے۔ ان سے پہلے وہاں انصاری قبیلے کے لوگ آباد تھے سید شکر اللہ کی اولاد میں سید محمد حسن بن سید علی اکبر بن سید عبدالواسع نا ہے کہ اس قبیلے کے کچھ لوگ سندھ کے رہنمائیں رہتے ہیں اور ان کے بزرگ جب کبھی نٹھنے آتے ہیں تو اس محلے میں آکر ہم سے ملاقات کرتے ہیں۔

”..... قبروں کے چبوترے جن میں (ان سادات کے) بزرگ آرام پذیر ہیں وہ ان کے (یعنی ان قبیلے والوں) کے تھے جن کی کئی قبریں آج بھی موجود ہیں۔“
”..... سید شکر اللہ کی قبر سید عبداللہ مغرب میں آج بھی اہل اللہ کے لئے زیارت گاہ ہے۔

”..... کہا جاتا ہے کہ مذکورہ سید کے علاوہ تین باکمل بزرگ بھی نٹھنے آئے تھے۔ ان کے دوستوں میں ایک خاص قسم کا اتحاد تھا۔ وہ بزرگ (۱) سید مبہ (۲) سید کمل اور (۳) سید عبداللہ ہیں“

(علی شیر قانع - بختہ الکرام "۱۸۷۵ھ، ص ص ۳۸۲-۳۸۳-۳۸۴)

”..... سید کمل — اصلاح شیراز کے باشاز کے باشندے تھے اور مذکورہ سید شکر اللہ کی دوستی اور رفاقت کے باعث نٹھنے آئے تھے — (جن کے) وہ گھرے دوست تھے اور ان چار دوستوں میں شامل تھے جن کا ذکر شکر اللہ کے بیان میں ہو چکا ہے..... وفات کے بعد وہ اپنی رہائشی حوالی میں دفن ہوئے، ان کے مقبرے کی برکات کئی ملکوں میں مشہور ہیں اور گرامات عوام اور خواص کے دلوں میں محفوظ ہیں“

(ایضاً ص ۳۹۳)

”سید شاہ مبہ“ یہ غوث الشقین (پیران پیر) سے ہیں۔ بزرگوار سید کمل شیرازی اور سید شاہ عبداللہ حسینی کے ساتھ شاہ بیگ ارغون کے زمانے میں سید شکر اللہ شیرازی کے ہمراہ نٹھنے آئے تھے (جن سے) ان کو خاص محبت تھی۔ پڑوس کی رفاقت کے خیال سے وہ اس جگہ اب آرام پذیر (مدفن) ہیں۔ ایک مرد کے گھر آکر نھرے

تھے۔ ان کی کرامت روشن اور مشور ہیں۔ ان کے مقبرے کی زیارت عام خلق خدا کے حصول حاجات کی صاف ہے۔ (ایضاً "ص ص ۴۰۲)

"سید شاہ عبداللہ وہ بھی قطب الاقطاب، غوث الشفیعین، حضرت پیر حسینی علیہ الرحمۃ کی اولاد میں سے ہیں اور نمکورہ (چار) دوستوں یعنی سید مسیح، سید کمل اور سید قاضی شمس اللہ میں سے ایک مفتدر دوست تھے۔ وہ بزرگوار۔ شاہ بیگ ارغون کے زمانے میں تھنھے آئے اور خفیہ طور پر پہاڑی کی اس جگہ پر بیٹھ کر گوشہ نشینی اختیار کی تھی جہاں ان کا مزار موجود ہے۔ کمل کے اس حصے پر بیٹھ کر جو روحانی فیض ان بزرگ کو حاصل ہوا، وہ قلم کے ذریعے بیان کرنے سے باہر ہے۔" (ایضاً "ص - ص ۶۱۵-۶۱۶)

سندھ پر مسلمان ارغونوں کے حملے کے وقت اور سات دن ان کے ہاتھوں تھنھے کے قتل عام اور لوٹ مار کے وقت سندھ اور سندھ کے شر تھنھے کی اسلامی فضا کچھ اس طرح کی تھی :-

"روایت ہے کہ (سندھ کے بادشاہ) جام نقام الدین علم کے عاشق تھے، ابتدائی تعلیم مدرسوں اور خانقاہوں میں حاصل کی تھی، وہ نمائیت حلیم خلیق اور بہترین صفات و حسین عادات کے مالک تھے۔ وہ کمل کی حد تک زاہد و عابد بھی تھے۔ ان کی فضیلت اور اصل حقیقت اس سے بھی بلند ہے جو قلم بند کی گئی ہے۔ ان کی حکومت کے دنوں میں سنت نبوی کی پیروی اس حد تک عام ہو چکی تھی جس کا تصور بھی ممکن نہیں۔ مسجدوں میں باجماعت نماز پڑھنے کا رواج اس قدر ہو گیا تھا کہ کوئی بھی چھوٹا یا بڑا اکیلا جا کر مسجد میں نماز پڑھنا پسند نہ کرتا تھا۔ اگر کبھی کسی وقت کوئی باجماعت نماز ادا نہ کر سکے تو پشیان رہتا اور دو تین دن تک استغفار پڑھتا رہتا۔" (تاریخ معصومی۔ ص - ص ۱۰۲)

اور اس کے بعد جب مسلمان ارغونوں کے حلیف مسلمان مغل حاکم تھے اور ان

کے ظلم کی کلی رات چھائی ہوئی تھی تب ٹھنڈھے کی اسلامی فضا کا تاریخ میں یہ ذکر آیا ہے:-

"... عالم، فاضل، شاعر، کاتب، خوش نویس اور خدا پرست اشخاص اس شر میں بہت زیادہ رہتے تھے — اور ان کے اکثر لوگ پکے مسلمان تھے اور روزے نماز اور شرع کی پیروی کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ اس قدر کہ یہاں کئی بڑی جامع مسجدیں ہیں، جن میں ۲۰ اور ۳۰ ہزار لوگ جمعہ کی نماز کے لئے اکٹھے ہوتے تھے۔ جامع مسجدوں کے علاوہ شرود کے محلوں میں چھوٹی، چھوٹی مسجدیں ہیں، وہ سب جمع کے دن اس قدر بھری رہتیں کہ عین نماز کے وقت اگر کوئی نماز کے لئے آتا تو بمشکل اسے نماز کے لئے مجھے مل سکتی۔"

(منظر شاہجمانی "میر کیوسف" بسح اور حاشیہ وغیرہ حام الدین راشدی ص ۳۲۰)
افراد کا منظم گروہ، جو بیرونی حملہ آور فوج کے فائدے کے لئے ملک کے اندر بیٹھ کر کام کرے اور ان کے لئے اندر ہی اندر میدان تیار کرے۔ شاہ بیگ ارغون نے ۷۷۴ھ (۱۵۶۰ء) میں سندھ پر حملہ کرنے سے پہلے اپنے چار دوستوں پر مشتمل ایک ٹولہ ٹھنڈھے روانہ کیا تھا جو تاجریوں کے بھیس میں آئے۔ اس میں ایک خاص قسم کا اتحاد تھا۔ وہ بعد میں خود کو غوث الشفیعین پیران پیر دھیر کی اولاد کملاتے تھے۔ انہوں نے ظالم و جابر ارغونی حکومت کی مضبوطی اور اس کو جاری رکھنے میں ارغونوں کی مذہبی مدد کی اور ان سے مل نغیمت اور اقتدار میں شریک رہے۔

اس طرح ۷۷۳ء میں سندھہ نادر شاہ کے حملے سے صرف دو سال پہلے اس کے پہ سالار، احمد شاہ ابدالی کے پیرو شاہ فقیر اللہ علوی اپنے ملک (روہیں جلال آباد افغانستان) سے ہر اول دستے کے طور پر اپنے پورے گروہ سیاست ٹھنڈھے اور پھر شکار پور آئے۔ ٹھنڈھے کی مختصر رہائش کے دوران انہوں نے منور محمد ہاشم کی شاگردی قبول کی اور ان سے علوم ظاہری اور اسلوک مخفی اور فقر کی تینیں سلسلہ جات کی اجازت

حاصل کی۔ ۷۲۷ء میں نادر شاہ قتل ہوا اور احمد شاہ عبدالی خراسانی اور سلطنت نادریہ کی مشرقی اراضی کا دعویدار ہوا۔ سندھ کو اسکے ہاتھوں اور اس کے جانشینوں کے ہاتھوں جو صوبیں اور پریشانیاں لمیں اس کی داستان خود نادر سنگاک کے خون ریزی لوث مار اور تباہ کاریوں کی داستان سے کم دردناک نہیں۔ لیکن احمد شاہ عبدالی پھر بھی اس اللہ کے بزرگ حاجی فقیر اللہ علوی کے اتنے معتقد خاص اور مرید صادق تھے کہ سندھ میں داخل ہوتے ہی جوتے اتار دیتے اور نگئے پاؤں ملتے کیونکہ یہ ان کے مرشد کا وطن تھا اور وہ اپنے مرشد کے پیروں کی مٹی تیرک کے طور پر اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ سندھ کی تاریخ میں مذہب اور سیاست، کی یعنی ایمان اور اقتدار کی استبدادی اور استحصالی شرکت کی یہ کوئی اپنی نوعیت کی واحد یا پہلی یا آخری مثل بھی نہیں۔

سل ۷۰۵ء میں ایک یورپی سافر، یلسنک، اتفاق سے سندھ کع روہڑی شر میں جائلا اور وہاں کی دکھی قابل رحم حالت دیکھ کر پکار اٹھا ”یہ شرس کس قدر دکھی لوگوں سے بھرا ہوا ہے“۔

چالیس سال بعد ۷۳۵ء میں ایک دوسرے یورپین سافر، اس اپل، نے شمالی سندھ کی سیر کرتے ہوئے وہاں کے آباد کاروں اور کسانوں کی حالت دیکھ کر لکھا ہے کہ وہ ”بے حد مجبور اور مظلوم تھے۔“

۷۵۹ جنوری ۷۵۹ء میں ایک انگریز تاجر نے اپنے برطانوی تاجر ساتھیوں کو ایک خط لکھا جس میں انہیں بتایا ”یہاں (سندھ میں) تقط اور پلیک کے باعث لوگوں کا بڑا حصہ ختم ہو گیا ہے اور باقی تھوڑے بست بچ گئے ہیں۔“

۷۹۹ء میں جب (شاہ عبدالطیف بھائی دس برس کے تھے) ایک انگریز سیاح ہمیشہ جب نہیں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کے وہاں پہنچنے سے پہلے ۸۰ ہزار کوری (جولاہے) پلیک کی بیماری کی وجہ سے مر چکے تھے۔ سندھ کی حالات کا ذکر کرتے ہوئے آگے چل کر وہ بتاتا ہے کہ تمام راستوں پر سفر بہت ہی خطرناک تھا اور اس کا عام طریقہ یہ تھا کہ

اونٹوں کے قافلے چلتے تھے جن کے ہمراہ ایک سو سے دو سو تک گھوڑے سوار حفاظت کے لئے ساتھ ہوتے تھے۔ اس نے ایک قافلے کا ذکر بھی کیا ہے جس پر راستے میں چار پانچ ہزار لیوروں نے حملہ کیا ان کے دو سو پچاس گھوڑے سوار محافظ اور پانچ کے قریب سو داگروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

”مغلوں کے آخری زمانے کے ایک شخص کے نواب اعظم خان کا اندازا“ چار برس کا (۱۵۷۱ - ۱۵۷۲) دور اہل سندھ کے لئے نخوست کا زمانہ تھا۔ ایک تو ملک میں سخت تحفظ کی حالت تھی دوسرے ایک حق شناس شاہ عنایت شاہ کی شادت کا واقعہ پیش آیا۔ داؤد پوشہ ”شاہ شہید“ رسالہ ”نئی زندگی“ مئی ۱۹۷۰ء

ارغونوں، ترخانوں اور مغلوں کے دور کے اس عام ابتلا اور بد امنی کے حالات کے برخلاف اس سے پہلے کی آزاد اور خود مختار سندھ کے حالات کیسے تھے؟ اور راویت کرتے ہیں کہ اس جام نظام الدین نے سندھ کا داخلی اور سرحدوں کا ایسا انتظام رکھا تھا کہ لوگ بڑے ایمنی سے راستوں پر سفر کرتے تھے۔ اس کے دور حکومت میں عالم، صلح اور دریشوں نے بڑے آرام سے وقت بسر کیا اور رعایا اور سپاہی بھی آسودہ اور خوشحال رہے۔ (تاریخ معصومی“ ص ۱۰۳)

”کلموڑا حکمرانوں نے زرعی کام میں جتنی دلچسپی اور تندی سے کام کیا اس بنا پر وہ سندھ میں سب سے زیادہ نہیں اور نالے بنائے والوں میں شمار ہوتے ہیں،“ خاص طور پر میاں نور محمد نے شمالی سندھ میں جہل پہلے پہل ان کی حکومت قائم ہوئی نہروں کے ذریعے کیجیتی باڑی شروع کی۔

”انہوں نے سندھ میں گھاڑواہ کا سرشتہ قائم کیا جس میں نورواہ (دس میل) شاہ جی کڑ (۲۰ میل) اور داتے جی کڑ (۲۰ میل) شامل تھیں جس میں آگے چل کر پہلی نہ دریائی سندھ پر جدید بیراج کے آبپاشی نظام میں وارہ کی شاخ ہائی نہر کے طور پر استعمال ہوتی ہے،“ اور دوسرے نالے اس نظام میں دوسری شاخوں کے طور پر کام میں

آئے۔ کلموڑا دور ڈاتھی کٹر پر لاڑکانہ سے شداؤ کوڑ تک مسافری اور بارداری کے لئے کشتیاں بھی چلتی تھیں۔

دریائے سندھ کے بائیں کنارے کے ساحل سے کلموڑوں نے نئے نالے کھدوائے مٹا" (نوشترہ ڈویٹن میں) نفرت ہالہ، مراد ہالہ، باغ ہالہ اور فیروز ہالہ جو سب نوکھی آپاسی سرنشتے کے حصہ تھے، سب نالے بعد میں روہڑی کینال سے ملا دیئے گئے۔

"اس طرح کلموڑوں نے وسیع غیر آباد زمینوں کو آباد کیا، مگر پھر بھی وہ نظام آپاشی کے جدید علمی معیار کے مطابق کوئی بڑے انجینئرنگ تھے اس لئے ان کے ہالوں میں اتنی ترتیب اور سندھ نہ تھی انہوں نے تقریباً ہر اس جگہ نالے بنائے جہاں سے پہلے دریائے سندھ کے بننے کے نشانات موجود تھے اور ان کے ہالوں کا رخ موجودہ جھیلوں کی طرف رہتا تھا۔ اس لئے ان ہالوں اور چھوٹے دریاؤں کی مجموعی لمبائی ہزاروں میل بن جاتی تھی۔ لیکن ونکہ با اختیار مقامی حکمران تھے۔ اس لئے ایسے آپاشی کا پورا نظام وہ اپنی محمد اشت میں پھر بھی اچھی طرح چلانے میں کامیاب رہے۔"

یہ شاہ اور سماں کے دور میں سندھ کی تہذیبی میدان میں محب وطن قومی ریاست کی پناہ میں زرعی اجتماعی معاشی بہبو کے لئے کی گئی عظیم کوشش کی مثال ہے۔

"ترک سیاست، ضعف ریاست است۔۔۔۔۔ و ریاست بالسیاست واجب،
ورد مقدمہ عدالت خود را وغیر ربیک نظر باید دید۔۔۔۔۔ در خیر فکر شروع در فکر خیر،
نفع شمايان سرا سر در اخلاص و محبت است۔ اول حق غرباء و مساکين و یتيمان و
مطوبان عائد گجردن میشود روز و شب فکر ملکداری۔۔۔۔۔ و هر آفریده بمتربدانید،
و هر مرد را مرد بد انید

(اردو ترجمہ۔۔۔۔۔ سیاست کو چھوڑنے کا مطلب ہے ریاست کی کمزوری۔۔۔۔۔)

کیونکہ ریاست (کی کامیابی) کے لئے سیاست ضروری ہے..... عدل انصاف کی ہربات میں خود کو اور دوسرے کو ایک نظر سے دیکھنا چاہیے۔ خیر کہ وقت پر شر کی فکر اور شر کے وقت خیر کا خیال رکھنا چاہیے۔ آپ کی بھلائی ساری کی ساری اخلاص اور محبت میں ہے۔ پہلے پہل تمہاری گردنوں پر غریبوں، مسکینوں، تیموں اور ضرورت مندوں کے حق کا بوجھ ہے.... اور آپ کو دن رات ملک کے انتظام او بہبود کا خیال رکھنا چاہیے اور آپ کو چاہیے کہ ہر تخلیق کی ہوئی (چیز) کو مفید اور بہتر سمجھیں اور ہر انسان کو انسان سمجھیں....." "روایت ہے کہ شاہ صاحب نے اس دور کی بے مثال گلوکارہ مائی گلاں کو دعا دی گلاں سے گل ہو گا"۔ پھر اس کا نکاح نور محمد سے ہوا جس کے بطن سے غلام شاہ پیدا ہوا۔